مختلف مضامین

۱۴

علّامہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی
کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب قبلہ نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کارفرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی قبلہ کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ دُرّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحر العلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

مختلف مضامین – ۷

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	محنت اصول کے مطابق ہو تو کامیابی ملتی ہے، دعا میں شفا	۶۱	۱
۲	صوفی ابن الوقت ہوتا ہے، نفسِ امّارہ	۶۲	۱۲
۳	قصّۂ آدم کی حکمتیں	۶۳	۲۳
۴	بر شسکی گنان: نورے ھر لتن دیارد (دیوانِ نصیری صفحہ نمبر ۲۵۰) قصّۂ یوسفؑ کی تاویل، علمی اور نورانی دیدار	۶۴	۳۸
۵	قرآن میں اندھا پن کا ذکر	۶۵	۵۳
۶	کائنات کی ہر چیز علم کے گھیرے میں ہے۔	۶۶	۶۷
۷	ذکر و فکر	۶۷	۷۴
۸	عبادت اور امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے پاک فرامین	۶۸	۸۸
۹	توریت اور انجیل کا مقصد = ہدایت اور نور	۶۹	۱۰۲
۱۰	خدا کی معرفت، خیر و شر کا مضمون	۷۰	۱۱۳

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: محنت اُصول کے مطابق ہوتو کامیابی ملتی ہے، دعا میں شفا

کیسٹ نمبر: ۶۱ تاریخ: جنوری، ۱۹۸۲ء۔ کراچی

Click here for Audio

عزیزانِ من! قرآنِ مقدّس میں جتنے ارشادات ہیں اور جیسی جیسی نورانی ہدایات ہیں، اُن کے آپس میں ہرگز کوئی تضاد نہیں، وہ ہدایت سب کی سب مقصدِ اعلیٰ کی روشنی ہے یعنی ایک ہی آخری منزل کی طرف اُس میں رہنمائی ہے اور اُس میں کوئی شک نہیں۔ چنانچہ آج میں کچھ وقت کے لئے قرآن کے ایک اُصول کے سلسلے میں آپ کے سامنے کچھ باتیں بیان کرتا ہوں، آپ کے سامنے ایک اُصول کو لاتا ہوں، آپ سوچیں کہ اُس اُصول کے اندر کیسی روشنی ہے اور کیسی حکمتیں موجود ہیں۔ وہ اُصول ہے کہ: ''وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی'' (۳۹:۵۳) انسان کے لئے کچھ بھی نہیں مگر جو کچھ وہ کوشش کرتا ہے، وہی کچھ ہے۔ اب آپ اچھی طرح سے اِس میں سوچیں اور غور کریں۔ اب بھی سوچیں اور بعد میں بھی سوچیں کہ اِس کا مقصد کیا ہے؟ یعنی خداوندِ عالم کا یہ ارشاد کہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو کچھ کہ وہ کوشش کرتا ہے، سعی کرتا ہے۔ اِس زرّین اُصول کے اندر کوشش کی تعریف کی گئی ہے، محنت کی تعریف کی گئی ہے تو آپ مجھے بتایئے کہ وہ تقدیر کہاں ہے، قسمت کہاں ہے، مقدّر کیا شیٔ ہے، قضاو قدر کیا ہے؟ اِس کے لئے ''وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی'' (۳۹:۵۳) سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ انسان کو خداوندِ عالم نے کوشش [کی] ایک صلاحیت دی ہے جس کی خدا خود تعریف فرماتا ہے۔ کوشش اور محنت، خواہ دُنیا ہو یا دین، عالمِ ظاہر ہو یا عالمِ باطن، اُس میں کامیابی کا راز بندۂ مومن کی کوشش میں مضمر ہے، اور ہاں! یہ بات تو ضرور ہے کہ انسان کا نظریہ صحیح ہونا چاہیئے اور پھر کوشش کامیاب ہوسکتی ہے۔ اگر انسان صراطِ مستقیم سے ہٹ کر ہے تو اُس کے بہت سے اعمال بلکہ تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ مگر ہاں! صراطِ مستقیم کی طرف لوٹنے کے لئے اگر وہ جدوجہد کرتا ہے اور اُس میں خدا کی مدد دستگیری کرتی ہے اور وہ شخص واپس صراطِ مستقیم پر آتا ہے تو ایسی کوشش بھی کامیاب ہے۔ اگر وہ اِس کا خیال نہیں کرتا ہے اور صرف اپنے طور سے اعمال انجام دینے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سارے اعمال جو ہیں وہ ضائع ہوجاتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے۔

چونکہ کتابِ الٰہی جو ہے وہ مومنین کے لئے ہدایت نامہ ہے، یعنی خداوندِ عالم مخاطب ہیں مومنین سے اور جو کچھ ارشاد وہ فرماتا ہے وہ محض مومنین کے لئے ہے۔ لہٰذا یہ جو اُصول ہے کہ دُنیا کے اندر سب سے بڑی چیز کوشش ہے تو یہ اُصول

مومنین سے متعلق ہے یعنی مومنین سے کہا گیا ہے، مومنین کی کوشش کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس لئے ''وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ''(۵۳:۳۹) جو اُصول ہے اِس کو بہت سے ترقّی پسند علماء یا اسکالرز اور دیگر مسلمان جو ہیں، اِس کو بہت ہی توجّہ سے دیکھتے ہیں اور اپنے مقالوں میں جہاں مقالے محنت سے، مشقت سے، ترقّی سے متعلّق ہوتے ہیں تو اُس میں اِس اُصول کو لیتے ہیں۔ اِس لئے میں آج آپ کی توجّہ اِس آیت کی طرف دلاتا ہوں، ہمیشہ آپ اپنے لئے اِس کو (moto) بنائیں، مقولہ بنائیں کہ :: ''وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ''(۵۳:۳۹) انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو کچھ کہ وہ کوشش کرتا ہے۔ یعنی انسان کے لئے اُس کی کوششوں کے نتائج ملیں گے۔ اِس سے مومن کو حوصلہ ملتا ہے کہ مومن کی جو کوشش ہے، اُس کا ثمرہ اُس کو مل جائے گا اور ہر وقت محنت اور کوشش کی ضرورت ہے اور دُنیا کے معاملے میں بھی دیکھیں کہ اگر ایک شخص ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھتا ہے تو اُس کو کچھ نہیں ملتا ہے اور دوسرا وہ ہوشمند انسان، کاروباری یا تاجر جو اُصول کے مطابق کام کرتا ہے تو وہ ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح رُوحانی ترقّی کے سلسلے میں یہ بہت ہی ضروری ہے کہ مومن شب و روز محنت کرے، کوشش کرے۔

یہاں اِس حقیقت کو یعنی محنت کو کس طرح سے بیان کیا گیا ہے؟ اور دُوسری آیتوں میں دُوسری طرح سے اِس کو بیان کیا گیا ہے۔ کہیں تو اِس کا ذکر جہاد کے عنوان سے ہے، یہ ایک آیت ہے اُس کا مفہوم میں آپ کو بتاتا ہوں کہ خداوند عالم فرماتا ہے کہ: [''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا''۔ ۲۹:۶۹] جو ہمارے سلسلے میں اور ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے، تو ہم اُن کو اپنے راستے بتلائیں گے۔ دیکھا آپ نے کہ خداوندِ عالم پہلے کسی کو اپنے راستے نہیں بتلاتے ہیں، بلکہ اُس کے لئے یہ شرط رکھتے ہیں کہ کوئی مومن اُس کی راہ میں جدوجہد کرے تو تب خدا فرماتا ہے کہ وہ مومن کو اپنے راستے بتائیں گے، تو اِس سے مُراد رُوحانیت کے رستے ہیں، روشنی کے رستے ہیں، علم کے رستے ہیں اور ہدایت کے رستے ہیں، خداشناسی کے رستے ہیں اور جنّت کے رستے ہیں، تو یہ سب راستے جو خزانوں کی طرف جاتے ہیں، جو بہشت کی طرف جاتے ہیں، جو خدا کے دیدار کی طرف جاتے ہیں، یہ سب اُس وقت دکھائی دے سکتے ہیں جب کہ مومن جدوجہد کرے، کوشش کرے۔ یہ اِس لئے کہ انسان کو اِس دُنیا میں جو بھیجا گیا ہے تو اُس کے سامنے میدانِ عمل میں بہت سے امتحانات ہیں اور امتحانات کے یہ معنی ہیں کہ اُس کے ساتھ عقل ہے اور نفس ہے۔ آپ نے بارہا اِس قصّے کو پڑھا ہے اور غور سے پڑھا ہے کہ نفس اور عقل کے درمیان کیا کشمکش رہتی ہے۔ یہ کوئی ایک دن کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ یہ ایک دائمی جھگڑا ہے جو ہر روز ہوتا رہتا ہے۔ روزِ اوّل سے قیامت تک اور انفرادی طور پر جب ایک انسان ہوش سنبھالتا ہے تب سے موت کے آنے تک یہ کشمکش ہمیشہ رہتی ہے، یہ جھگڑا جاری رہتا ہے سوائے اِس کے کہ کسی مومن نے سعادت مندی سے اپنے نفس پر قابو کر لیا ہو، اپنے نفس کو پامال کیا ہو۔ اِس کے سوا عام حالت میں جھگڑا رہتا ہے، تو یہ امتحان ہے اور اِس امتحان کے لئے

صحیح جدو جہد کی ضرورت ہے تو محنت دو قسم کی ہے دنیا کے اندر۔ ایک محنت خدا کی منشاء کے مطابق ہے جسے خدا چاہتا ہے جو خدا کو پسند ہے، وہ محنت راہِ راست پر ہے، صراطِ مستقیم پر آگے بڑھنے سے متعلق ہے، وہ محنت ایسی ہے۔ دوسری محنت ایسی نہیں ہے، اِس کے برعکس ہے، وہ محنت ایسی ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے خلاف ہے، اِس آیت کے اندر جس شان سے محنت کی تعریف کی گئی ہے اُس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہر محنت مقبول ہے، یہ بات نہیں ہے۔ دُنیا کے اندر جتنی ذی رُوح مخلوق ہے یعنی رُوح والی مخلوق، دُنیا کے اندر جتنی ذی رُوح مخلوق ہے اُن میں سب سے زیادہ محنت جانور کرتے ہیں۔ دُنیا کے اندر گھوڑا جو محنت کرتا ہے، گدّھا جو محنت کرتا ہے، بیل جو محنت کرتا ہے اور ایسے دوسرے جانور جو مشقّت اُٹھاتے ہیں وہ مشقّت انسان کبھی بھی نہیں اُٹھاتا ہے۔ اگر محنت بجائے خود کوئی شئ ہوتی تو مقامِ حیوان پر محنت مقبولِ خدا ہوتی، یہ بات نہیں ہے۔ یہی مثال انسانوں کے درمیان ہے کہ کچھ لوگ حیوان کی طرح محنت کرتے ہیں وہ محنت اُصول کے مطابق نہیں ہے، وہ قرآن کے مطابق نہیں ہے، اللہ کی رِضا کے مطابق نہیں ہے، لہٰذا اُن کی محنت رائیگان جاتی ہے۔ آپ قرآنِ مقدّس کو اُٹھا کے دیکھیں، کیا قرآن اِس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ دُنیا کے اندر جتنے انسان ہیں، سب ہی صحیح ہیں؟ کیا قرآن میں اِس بات کی ضمانت ہے کہ ہر محنت قبولِ خدا ہوگی؟ یا یہ کہ قرآن میں یہ ذکر آیا ہے، قرآن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ: کچھ اعمال ضائع ہو جائیں گے، کچھ اعمال ضائع ہو جائیں گے اور بہت سے لوگوں کے اعمال ضائع ہو جائیں گے (۲:۴۹) اور تھوڑے لوگ ہوں گے جن کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے (۱۱:۱۱۵، ۷:۱۷۰)۔

بے شک مومنین کے اعمال کی قبولیت کی ضمانت دی گئی ہے اور مومنین کی کوئی نیکی ضائع نہیں جائے گی۔ مومنین کی ہر نیکی، ہر خدمت، ہر عبادت، ہر احسان، ہر محنت، ہر مشقّت خدا کے حضور میں قبول ہوگی اور ہر عمل کا کئی کئی گنا اجر و صلہ ملے گا اور اِس کے بعد پھر خدا اپنے حضور سے بھی مومنین کو نوازے گا، یہ قرآن کی بات ہے۔ آپ ضرور قرآن کے اندر ''خَاسِرِیْنَ'' کے لفظ کو پڑھیں اور ''خَاسِرِیْنَ'' کا کیا مطلب ہے؟ ''خَاسِرِیْنَ'' قرآنی زبان کا ایک لفظ ہے جو زیان کاروں کو کہا جاتا ہے۔ زیان کار فارسی اور اُردو میں ایک لفظ ہے، اُن لوگوں کو کہتے ہیں جنہوں نے کچھ کیا تھا کہ اُس میں خسارہ ہو گیا، تو قرآن میں زیان کار کا لفظ بار بار آیا ہے، ''خَاسِرِ'' اور ''خَاسِرِیْنَ'' کا لفظ بار بار آیا ہے۔ جو لوگ کچھ بھی نہیں کرتے ہیں اور اُن کو جو سزا ملتی ہے تو اُن کا نام زیان کار نہیں ہے، جو لوگ کچھ کام کرتے ہیں اور وہ غلط کرتے ہیں اور اجر دینے والا، جو اُن کو اجر اِس لئے نہیں دیتا ہے کہ اُس کا منشاء نہیں تھا، وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ دُنیا کے اندر کوئی بھی کام ہے، کوئی بھی خدمت ہے تو اُس خدمت کا کوئی لائحۂ عمل ہوتا ہے، کوئی پروگرام ہوتا ہے، کوئی مقصد ہوتا ہے اُس لائحۂ عمل کے مطابق، اُس پروگرام کے مطابق کام کیا جاتا ہے اور اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ کام ضائع ہو جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ ایسے غلط کام کرنے والوں پر جُرم بھی آتا ہے، جُرم بھی عائد ہو جاتا ہے۔ اِس لئے محنت کی بات تھی تو محنت اُصول کے مطابق ہونی چاہئے اور خدا کے حضور سے جو دینِ اسلام میں

ایک معیار ہے، ایک کسوٹی ہے اور جو ہدایت کی کسوٹی ہے، علم کی کسوٹی ہے، حق و باطل کی کسوٹی ہے اِس کسوٹی کے مطابق اور اِس معیار کے مطابق اعمال ہونے چاہئیں، محنت ہونی چاہئے، تو محنت بہت ہی ضروری شئ ہے، محنت کے بغیر کچھ نہیں ہے۔

اِس لئے اُصول ہو اور پھر محنت ہو تو کامیابی ضرور ہو سکتی ہے، اور دیکھیں کہ اسلام جو دین ہے وہ ایک منطقی دین ہے یعنی اُس کی بنیادیں حقیقتوں پر مستحکم ہیں اور اسلام جو دین خدا ہے، اسلام جو دین فطرت ہے یہ آفاقی دین ہے، کائناتی دین ہے اور یہ بالکل اِس کائنات کی (nature) کی طرح ہے یعنی دُنیا کے اندر، اِس کائنات کے اندر آسمان و زمین میں جو خدا کی قدرت کے آثار ہیں، جو نشانیاں ہیں اور تخلیق کا جو نظام ہے، بالکل اسلام بھی اِسی طرح سے ہے۔ اِسی لئے اسلام کو دین فطرت کہا جاتا ہے۔ جب اسلام دین فطرت ہے تو ہم اِس فطرت کو، (nature) کو، دُنیا کو دیکھتے ہیں، کائنات کو دیکھتے ہیں کہ یہ کس طرح قائم ہے؟ یہ ایک اُصول کے تحت قائم ہے اور دُنیا کے نظام میں سے یہ ہے کہ دُنیا کے اندر کسی بھی ہنر کو، کسی بھی پیشے کو، کسی بھی کاریگری کو کرنے کے لئے یا کسی چیز کو وُجود میں لانے کے لئے جو کام کیا جاتا ہے، اُس کے لئے ایک (technique) ہوتی ہے، ایک اُصول ہوتا ہے، ایک (principle) ہوتا ہے۔ اُس کے مطابق کام جو ہے پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اِس طرح دین بھی ایک قانون ہے تو اُس قانون کے مطابق دین کا کام آگے بڑھتا ہے اور کوئی شی دینی طور پر، رُوحانی طور پر وُجود میں آتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک (machinery) کو لیں، ایک جہاز کو لیں، ایک موٹر کو لیں کہ اِس کے اندر کتنے کَل پُرزے ہیں اور وہ ایک خاص نظام کے مطابق کام کرتے ہیں اور اُن کا رابطہ ہے، (connection) ہے اور اِس (machine) کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی صحیح (position) میں ہو اور جو چیزیں جس طرح سے لگی ہوئی ہیں اور جو تاریں جس طرح جڑی ہوئی ہیں اور جو کَل [پُرزے] جیسے کام کرتے ہیں اُن کے لئے کوئی رُکاوٹ نہ ہو تو پھر وہ کار، وہ (machine) جو ہے کام کرے گی اور اگر اُس میں کچھ گڑبڑ ہے یا خرابی ہے یا اُس میں کوئی کسی چیز کی کمی ہے تو وہ (machine) چلے گی ہی نہیں۔ اِسی طرح مومن اُصول کے مطابق کام کرے تو اُس کی ترقّی آگے بڑھے گی اور کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک ذرا یہاں سوال کرتے ہیں کہ ہماری جو ترقیاں رُکی ہوئی ہوتی ہیں بعض دفعہ یا اکثر دفعہ اُس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اِس وجہ میں دو طرفہ غور کریں گے۔ کیا یہ وجہ خداوند کی طرف سے ہے کہ اُس نے نہیں چاہا؟ یا یہ کہ اُس نے چاہا ہے غلطی ہماری طرف ہے؟ اِس میں ذرا سوچنا چاہئے۔ اِمکانی طور پر یعنی ممکن ہے کہ وہ نہیں چاہتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ غلطی ہماری طرف سے ہو یعنی ہمارا دل کیا کہتا ہے؟ آپ کیا سوچیں؟ یہ دائرۂ امکان ہم کھینچتے ہیں، (circle) بناتے ہیں کہ یعنی ترقّی کسی کی جو رُکی ہوئی ہے وہ اِس دائرۂ امکان سے باہر نہیں ہے اور اِس کی دو بڑی اور بنیادی وجہیں ہیں یا یہ ہے کہ خداوند نہیں چاہتا ہے، بات ختم ہو گئی یا یہ کہ خداوند تو چاہتا ہے لیکن بندے کو جو اُصولات دیئے گئے تھے اور بندے کو جس قدر محنت کرنی تھی وہ یہ نہیں کرتا ہے، یہ بھی ممکن ہے۔

اب ہم سوچیں گے اور صحیح معنوں میں سوچیں گے، پہلے تو ہم نے امکانیت کا تعیّن کیا، اب ہم غور سے اور زیادہ آگے بڑھیں گے، سوچیں گے۔ عقل سے سوچا جائے تو یہ بات ناممکن ہے کہ خدا نہ چاہتا ہو، خدا کیسے نہ چاہتا ہو؟ خدا اگر نہیں چاہتا ہے تو گویا کہ ہم پر کوئی (force) مسلّط کر رہا ہے اور ہمیں کام کرنے نہیں دے رہا ہے۔ اُس صورت میں ہماری عقل، ہماری قوتیں، ہماری صلاحیتیں، ہماری رُوح، ہمارا جسم منجمد ہو جائے گا، کام نہیں کرے گا پھر کل کو کیسے پوچھ سکتا ہے ہم سے کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا اور یہ کیوں نہیں کیا؟ تو کیا یہ بھی کوئی انصاف کی بات ہے؟ ایسا نہیں ہے، وجہ جو ہے اِس طرف ہے [یعنی] ہماری طرف ہے۔ ہمیں ایک عالی قدر (missionary) نے بتایا کہ حضرت مولانا امام سلطان محمّد شاہ صلوات اللہ علیہ کا زمانہ تھا کہ مہمانیاں تھیں، لوگ سوالات کرتے تھے، ایک مومن تھا جو بہت اچھا مومن تھا، گفتگو کرے تو اُس کی گفتگو سے خوشبو آوے، ایسا اچھا مومن تھا، تو وہ امامؑ کے حضور میں آئے اور درخواست کی یا خداوند! میری رُوحانی ترقّی نہیں ہو رہی ہے۔ مولا نے فرمایا تمہاری رُوحانی ترقّی نہیں ہو رہی ہے، اُس کی کیا وجہ ہے؟ ذرا جلال میں آئے۔ خداوند بہتر جانتا ہے، میری رُوحانی ترقّی کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں ہو رہی ہے اور میں کتنے برس سے میں اِس کام میں، بڑے کام میں لگا ہوں لیکن کچھ بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے۔ خداوند نے فرمایا کہ دیکھو میں نے جو کچھ وعدہ کیا ہے اُس کو ہونا چاہئے اور اگر نہیں ہوتا ہے تو اِس میں یا تو تم جھوٹے ہو یا میں جھوٹا ہوں۔ بندۂ مومن رونے لگا، خداوند آپ کیسے جھوٹے ہو سکتے ہیں، گناہ میری طرف ہو گا، قصور میرا ہو گا، تو امامؑ نے بتایا کہ دیکھو تم میں فلان غلطی ہے، تم فلان کام کرتے ہو اور جس کی وجہ سے تمہاری رُوحانی ترقّی رُکی ہوئی ہے، تو وہ بندۂ مومن، بہت زیادہ رونے لگے اور پھر وہاں سے رخصت ہوئے، تو بات یہ ہے کہ امامؑ جب خوشی سے، خوشنودی سے کوئی چیز دیتے ہیں تو وہ کنجوسی سے، بخالت سے نہیں دیتے ہیں، بڑی مہربانی سے دیتے ہیں، خوشی سے دیتے ہیں اور چاہتے ہوئے دیتے ہیں، دُعاؤں کے ساتھ دیتے ہیں اور پھر دُعا میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی ہے کیونکہ ہم امامؑ کے بچّے ہیں، وہ ہمارے رُوحانی باپ ہیں اور بڑی شفقت سے دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم اِس چیز کو استعمال کریں اور اِس سے فائدہ اُٹھائیں۔ اب پھر کیا رہا؟ اگر ہم اِس کے باوجود یہ گمان رکھتے ہیں کہ امام نہیں چاہتا ہے اور امامؑ کی دُعا اِس میں نہیں ہے تو یہ ہماری طرف سے ایک الزام ہے اور بہت بڑا گناہ ہے، امام کے متعلّق ایسا چاہنا تو یا ایسا سوچنا اور ہمارا یوں سوچنا بہت غلطی کی بات ہے، غلطی پر مبنی ہے۔ اِس کے بجائے کہ ہم اپنی کمزوریوں کو دیکھیں گویا کہ ہم نے اپنی آنکھیں باندھ لی ہیں، اپنی کوتاہیوں کو، کمزوریوں کو نہیں دیکھ رہے ہیں، اپنی کمزوریوں کی طرف سے ہماری جو آنکھ ہے وہ اندھی ہو گئی ہے گویا۔ پھر ہم تبھی تو اِس کو قسمت پر ڈالتے ہیں، کبھی تقدیر پر ڈالتے ہیں، کبھی پھر چاہتے ہیں کہ امام دُعا کرے۔ امام نے تو دُعا کی تھی، اور بھی کرتے ہیں لیکن قصور انسان کا ہوتا ہے، غلطی اُسی کی ہوتی ہے، تو ہوشمند مومن کو اچھی طرح سے سوچنا چاہئے کہ رُکاوٹ کہاں ہے۔

دیکھیں! دُنیا کے اندر ابھی میں نے مثال دی تھی کوئی (machine) ہے، کوئی جہاز ہے، وہ صحیح کام نہیں کرتا ہے تو اُس کے لئے جاننے والے ہوتے ہیں اور وہ اُس کی (technical) غلطی کو دیکھتے ہیں اور اُس کو (find out) کر کے اُس کی اصلاح کرتے ہیں، اُس رُکاوٹ کو دُور کرتے ہیں۔ پھر وہ چیز صحیح کام کرنے لگتی ہے تو اِسی طرح ہم اپنے باطن کو کیوں نہیں دیکھتے ہیں؟ اپنے باطن کی اصلاح کیوں نہیں کرتے ہیں؟ اپنے دل کو، اپنے اعضاء کو، اپنے ظاہر و باطن کو ہمیشہ سامنے کیوں نہیں رکھتے ہیں؟ ہمیں یہ کام ضرور کرنا ہے اور ضرور کرنا ہے۔ ہاں! ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے ارادے پر قائم نہیں رہ سکتے ہیں کیونکہ ارادے پر قائم رہنا اور اپنے (will-power) کو مضبوط بنانا یہ بھی تو ایک کام ہے، لیکن یہ کام ایک دن میں نہیں ہو سکے گا، اِس کے لئے وقت چاہئے اور آہستہ آہستہ اِن شاء اللہ اگر مومن کوشش کرے اور ہر بات میں، ہر کام میں مولا سے یاری چاہے، مولا سے یاری چاہنا حقیقت ہے، مولا سے یاری چاہنا ادب ہے، تمیز ہے، انسانیت ہے اور ایمان کا تقاضا ہے لیکن مومن کو بہت کچھ ذاتی طور پر کرنا ہے اور اِس کے بغیر رُوحانی ترقّی بہت مشکل ہے۔ اب میں ذرا رُک کے آپ کے کسی سوال کے لئے انتظار کرتا ہوں۔

اِنہوں نے سوال کیا کہ میرے کسی لیکچر کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھا کہ فرشتے ہوتے ہیں کسی مومن کے لئے، ذاتی فرشتے ہوتے ہیں؟ ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ جہاں حقیقت اور تصوّف کے مطابق انسان ایک دُنیا ہے اور اِسی طرح ہر مومن ذاتی طور پر ایک دُنیا ہے تو اُس دُنیا کے اندر بہت کچھ ہے، فرشتے بھی ہیں اور ہر چیز ہے، تو اُس میں جو فرشتے ہوتے ہیں، نمایاں اور زیادہ کام کرنے والے اور قریب کے جو فرشتے ہوتے ہیں وہ فرشتے اُس بندۂ مومن کے متعلقین ہوتے ہیں یعنی وہ لوگ جن کا اِس کے ساتھ تعلّق ہے، علمی طور پر اور نظریاتی طور پر جو لوگ اِس بندۂ مومن سے وابستہ ہیں اُن ہی کا یہ حق ہوتا ہے کہ وہ فرشتوں کے طور پر کام کریں۔ جس طرح ہم یہ مانتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں حضورؐ کے لئے جو جبرائیل، میکائیل، اسرافیل فرشتوں کی حیثیّت سے کام کیا جاتا تھا تو وہ فرشتے خود آنحضرتؐ کے اصحابِ کبار میں سے تھے۔ چنانچہ یقیناً یہ مانا جاتا ہے کہ سلمان فارسیؓ ایک فرشتہ تھے اور یہ وسیع پیمانے پر مانا جاتا ہے کہ جبرائیل جو ہیں دحیۂ کلبی کی شکل میں ہوتا تھا یہ جو عام روایات ہیں اُن میں یہ ہے۔ ہمارے نزدیک سلمان فارسیؓ کی شکل میں جبرائیل ہوسکتا ہے اور کسی دوسرے اصحاب کی شکل میں بھی ممکن ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جو جبرائیل کی شکل زمانۂ آدمؑ میں، زمانۂ نوحؑ میں، زمانۂ ابراہیمؑ میں اور زمانۂ موسیٰ اور زمانۂ عیسیٰ علیہم السّلام میں جو اصحاب تھے یا جو جبرائیل کی شکل تھی وہ زمانۂ رسولؐ میں کیوں نہ رہی؟ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور سوال کے بغیر علم جو ہے وہ پختہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ اِس لئے کہ جس طرح نورِ ازل سے ابد تک ایک خدا کی رسّی کی حیثیت سے ہے لیکن اِس نور کے لئے جامے یعنی لباس تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ زمانۂ آدمؑ میں اِس نور کا جو جامہ تھا کچھ اور تھا، تو ہر دَور میں اور آنحضرتؐ کے زمانے میں نورِ خدا جو تھا وہ آنحضرتؐ کی

شخصیّت میں اور مولا علیؑ کی شخصیّت میں تھا، اِس طرح یہ لازمی بات ہے کہ فرشتے بھی جو ہیں وہ اُن کے اصحاب ہوں۔ اب تو یہ بڑے دَور کی بات ہوگئی اور چھوٹی مثال میں اگر کسی مومن پر معرفت کا تجربہ ہوتا ہے وہ راہِ مستقیم سے آگے بڑھتا ہے، رُوحانیت کے واقعات کو دیکھتا ہے تو پھر اُس وقت یہ سب کچھ عالمِ صغیر میں ہوگا، عالمِ صغیر کا مطلب یعنی انسان کی جو ذاتی دُنیا ہے، اِس ذاتی دُنیا کے اندر جو کچھ سمویا ہوا ہے وہی یہ کام کرے گا اور یہ چونکہ رُوحانیت کے بھیدوں میں سے ہے اِس واسطے زیادہ ہم اِس کی وضاحت نہیں کر سکتے ہیں۔

سوال: سر! بعض دفعہ بیماری کی کیفیّت میں اور ویسے بھی تسبیح نکالتا ہے تو اُس کی صحت کو فائدہ پہنچتا ہے، تو دَوا کی طرح وہ کام کرتی ہے تو سر وہ کس طرح؟ جواب: اِنہوں نے ایک اہم سوال کیا وہ یہ کہ اسمٰعیلی نظریے کے مطابق ہم دُعا کو بھی مانتے ہیں اور دَوا کو بھی مانتے ہیں اور دَوا کو یعنی (medicine) کو ضرور اہمیت حاصل ہے اور اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے لیکن دُعا یعنی خدائی طاقت بھی بہت بڑی چیز ہے۔ اب دیکھیں کہ خداوندِ عالم نے دُنیا کے اندر جو چیز پیدا کی ہے اُس چیز کے اندر ایک تاثیر رکھی ہے، ایک اثر ہے یا ایک خاصیّت ہے، دُنیا میں پھل ہیں، اُن کے ذائقے الگ الگ ہیں، پھول ہیں، اُن کی بُوئیں الگ الگ ہیں اور جڑی بوٹیاں ہیں، اُن کی تاثیرات الگ الگ ہیں لیکن اِس کے پس منظر میں کیا ہے؟ حالانکہ یعنی چار (elements) ہیں، چار عناصر ہیں۔ مٹّی ہے اور ہَوا ہے، مٹّی ہے، پھر پانی ہے، ہَوا ہے اور آگ ہے۔ یہی چار چیزیں ہیں لیکن اِن چار چیزوں کے ملنے سے دُنیا کے اندر کتنی قسم کی جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں؟ نباتات، جانور اور فصلیں، پھول، پھل۔ کیا راز ہے ایک ہی مٹّی سے اتنی مختلف چیزیں پیدا ہوتی ہیں؟ ایک ہی مٹّی سے یعنی ایک ہی کیاری سے مرچ بھی پیدا ہوتی ہے، گنا بھی پیدا ہوتا ہے اور دوسری چیز بھی پیدا ہوتی ہیں۔ ایک میں جو ہے وہ یعنی کہ کھٹاس ہے، ایک میں شیرینی ہے اور ایک میں تلخی ہے جس کو آپ تیکھا کہتے ہیں۔ اب جو مرچ ہے اُس کا یعنی (taste) الگ ہے اور اِس سے ہٹ کر دوائیوں کے طور پر جو جڑی بوٹیاں استعمال ہوتی ہیں اُن میں بھی الگ الگ تاثیرات ہے۔ اِس میں کیا راز ہے؟ میرے نزدیک آپ اِن کا تجزیہ کرتے جائیں، اِس کا پس منظر کچھ ایسا ہے کہ یہ جا کر رُوحانیت تک یہ چیز جاتی ہے یعنی ہر چیز کے پس منظر میں ایک جوہر ہے اور جوہر کی ایک رُوح ہے اور رُوح کی بھی ایک رُوح ہے۔ اگر خدا چاہے تو رُوح سے کسی کو شفا دے سکتا ہے یعنی رُوحانی طور پر، خداوندِ عالم کے کلام میں اور نبیؐ اکرم صلعم کی حدیثوں میں بھی اِس کے اشارے ملتے ہیں کہ عبادت، ذکر، تقویٰ، صحت کے لئے ضروری ہے۔ معتبر کتاب میں ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السّلام بیمار ہوئے تھے اور بہت اُن کو تکلیف تھی اور اِس سے آنحضرتؐ کو بھی بہت پریشانی ہو رہی تھی کہ اتنے میں خداوندِ عالم کے حضور سے جبرائیل علیہ السّلام نازل ہوا اور وہ یہ حکم لے کے آیا کہ سورۂ فاتحہ جو ہے اِس پر پانی پر اِس کو پڑھ کر، دَم کر کے چالیس مرتبہ پڑھ کے اور اُس پانی کا چھانٹا دے دیا جائے یا اُس پانی میں اُن کو نہلایا جائے۔

جب یوں کیا گیا تو وہ ایک دم سے شفایاب ہو گئے۔ اِسی طرح خدا کا جو نام ہے اُس میں شفا ضرور ہے۔ قرآن کی ایک آیت ہے، اُس میں ارشاد ہے کہ: ''وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا'' (۱۷:۸۲) ہم قرآن میں اُس حصّے کو بھی نازل کرتے ہیں جس میں کہ شفا ہے، صحت یابی ہے بیماریوں کے لئے لیکن دیکھیں اِس میں سب لوگوں کے لئے شفا نہیں ہے۔ ''وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا'' (۱۷:۸۲) قرآن میں سے اُس حصے کو بھی ہم نازل کرتے ہیں جس میں کہ مومنین کے لئے شفا و رحمت ہے لیکن ظالم لوگوں کا اِس میں صرف گھاٹے میں اضافہ ہو جاتا ہے، اُن کا گھاٹا اور اُن کا نقصان بڑھ جاتا ہے اور قرآن اُن کو کچھ فائدہ نہیں دیتا ہے۔ اب اِس شفا میں سب سے پہلے رُوحانی شفا کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ جسمانی شفا بھی ہے۔ اِس لئے کہ قرآن میں تقویٰ ہے، قرآن میں پرہیزگاری ہے، قرآن میں ایسے اُصولات بتائے گئے ہیں کہ اُن پر عمل پیرا ہو جائیں تو نہ صرف اُن اُصولات پر عمل پیرا ہونے سے رُوح کو فائدہ ملے بلکہ ساتھ ہی ساتھ جسم کو بھی فائدہ ملتا ہے۔ جسم بیمار ہوتا ہے تو رُوح بیمار ہو جاتی ہے، رُوح بیمار ہو جاتی ہے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے لیکن جسم سے رُوح اُوپر ہے۔ اگر رُوح بیمار ہوئی تو جسم کا بیمار ہونا لازمی ہے اور اگر جسم بیمار ہے تو ممکن ہے کہ اِس میں رُوح بیمار نہ ہو کیونکہ رُوح جو ہے وہ طاقتور ہے یعنی زیادہ خرابی اِس میں ہے کہ رُوح بیمار ہو۔ لہٰذا رُوح کے لئے جن چیزوں سے شفا ملتی ہے اُن کو اپنایا جائے تو رُوح کی شفا کے ساتھ ساتھ جسم کو بھی شفا مل جاتی ہے۔

اِس کے علاوہ یعنی ذکر میں کئی طرح سے شفا ہے مثلاً انسان پرہیزگاری کے نہ کرنے سے بیمار ہو جاتا ہے، ہے نا؟ یہ بات مانی گئی؟ ٹھیک ہے۔ اب ایک مومن ایسا ہے کہ ہر وقت خدا کے نام کو جانچتا ہے، جانچتا ہے، جانچتا ہے تو اِس نامِ خدا کے نتیجے میں اُس کو کیا چیز ملتی ہے؟ توفیق اور کیا چیز ملتی ہے؟ ہدایت۔ آپ باور کرتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ اِس کو باور کرتے ہیں توفیق، کہ توفیق خدا سے آتی ہے اور ہدایت بھی، ہدایت کا ایک حصّہ جس کو یعنی (direct) آنا چاہئے تو وہ (direct) آتی ہے۔ جب ہدایت بھی ہے، توفیق بھی ہے تو مومن کس طرح اپنے کھانے، پینے اور رہنے سہنے کے معاملات میں غلط کر سکتا ہے؟ وہ (control) ہو جاتا ہے، (control) ہو جاتا ہے، آپ نے کیا یہ نہیں سوچا ہے؟ آپ نے بہت دفعہ دیکھا ہو گا، بہت سے مومنین ایسے ہیں جو محنت کرتے ہیں، جماعت خانے جاتے ہیں، سردی میں اُٹھتے ہیں، گرمی میں جاتے ہیں اور بندگی کر کے، عبادت کر کے کم سوتے ہیں اور دن کو بھی کام کاج کرتے ہیں حالانکہ ڈاکٹروں کا کہنا یوں ہے کہ اتنے گھنٹے سو جاؤ، سو جاؤ۔ آج کل دُنیا ایسی ہو رہی ہے کہ بس یعنی کہ نئی نسل بس چھٹی ہو تو وہ خوش ہو جاتی ہے کہ سو جائیں، دیر دیر تک سو جائیں، سو جائیں اور سو جائیں! لیکن ہم بہت سے مومنین کو دیکھتے ہیں وہ سوتے کم ہیں اور جاگتے زیادہ ہیں اور اُن کے کاموں کو دیکھتے ہیں۔ سب کام ٹھیک، صحت بھی ٹھیک، کھانا پینا بھی یعنی اعتدال سے صحیح اور کام کاج بھی کرتے ہیں، اُن

میں قوت بھی ہے، سب کچھ ہے، تو یہ کس کی بدولت؟ نامِ خدا کی بدولت اور نامِ خدا میں ضرور صحت کے راز پنہان ہیں، تو یہ بالکل صحیح بات ہے کہ جو کثرت سے خدا کو یاد کرے گا وہ، بہت کم بیمار ہو جائے گا اور اگر بیمار ہو جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا اور اگر کچھ دیر تک اِس کی بیماری رہی تو یہ بیماری بھی ہلکی ہلکی لگے گی اور اُس کو خوشی ہوگی، اُس کے گناہ کو معاف کیا جائے گا، تو عبادت کے کرنے اور نہ کرنے میں آسمان زمین سے بھی زیادہ فرق ہے اور اِس کے علاوہ جو ہے یعنی ایک بات یہ بھی ہے۔ سائنس نے آج کل حقیقت کو سمجھنے کے لئے بہت کچھ مدد کی ہے۔ ایک شخص پھلوں کو کھاتا ہے، دوسرا اُس کے رَس کو پیتا ہے، تیسرا رَس کے جوہر کو پیتا ہے اور چوتھا جوہر کے جوہر کو پیتا ہے اور پانچواں شخص ایک ایسی گولی کو منہ میں ڈالتا ہے کہ جو جوہر کے جوہر سے بنی ہوئی ہے۔ اب یہ چیز یہاں پر ختم نہیں ہوتی ہے، اس طرح جوہر کے جوہر کا جوہر جو ہے وہ رُوح ہے، تو ایک شخص اُس پھل کی رُوح کو حاصل کرتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اُس سے (energy) ہو۔

آپ کو شاید یاد ہوگا، میں نے کبھی یہ ذکر بھی کیا تھا کہ ایک بار جب مجھے غیر ملک میں قید میں رکھا گیا تو اُس وقت معلوم نہیں یہ میری آزمائش تھی کہ وہ لوگ مجھ کو آزمانا چاہتے تھے یا کیا کرتے تھے تو کھانے کو بہت ہی محدود کیا۔ اُنہوں نے دو چیزیں مقرّر کی، مجھے چائے تک نہیں دی گئی تو آپ سمجھ لیں کہ چاولوں کا اُبلا ہوا پانی یا کہ مکئی کی اتنی چھوٹی سی روٹی، لیکن اُس وقت مجھ پر رُوحانی انقلاب گزر رہا تھا تو اُس انقلاب والوں نے، فرشتوں نے اور مؤکلوں نے کہا کہ تم چاہو تو مت کھاؤ اِس کو ہم تمہاری مدد کریں گے، تو میں نے اُس کو نہیں کھایا اور اُس کو ترک کیا اور اِس کے نتیجے میں امامؑ کی رحمت کو جوش آیا، غیرت آئی تو پھر (gases) کی صورت میں مجھے (energies) سونگھائی گئیں، اور اُن خوشبوؤں نے غذا کا کام کیا اور پھر میں ایک وقت کے لئے غذا سے، کھانے پینے سے بے نیاز ہو گیا اور یہ مجھے ڈیڑھ مہینے کے عرصے تک یہ یعنی قید میں رکھا گیا تھا، اُس وقت تجربہ ہو گیا۔ یہ چیزیں دائمی طور پر نہیں مل سکتی ہیں اور اِس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں اور انسانِ کامل کو پہچان سکتے ہیں، پیغمبروں کی شناخت خوراک کے پہلو سے اور اماموں کی شناخت ہو سکتی ہے۔ لیکن میرا یقین ہے کہ وہ حضرات بھی اِس چیز کو ہمیشہ رکھنا پسند نہیں کرتے ہیں یا یہ کہ مصلحتِ خداوندی یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ یہ ہو مگر تجربے کے لئے ہوتا ہے اور چونکہ انسانِ کامل کو بھی اِسی دُنیا میں اور انسانوں کے ساتھ رہنا ہے اور اُن کو بھی کھانا پینا ہے، تو تجربہ معرفت کا اور خدا کی قدرت کا، وہ الگ چیز ہے۔ اُس کی پہچان کے بعد یعنی رُوحانیت کے جو مراحل ہیں یا جو اُونچے اُونچے درجات ہیں کہ اگر انسان اُن درجات میں مقرّر رہے تو عام انسانوں سے وہ الگ تھلگ ہو جاتا ہے اور اُس کا دماغ کچھ اور ہو جاتا ہے، تو پھر انسانوں میں نہیں رہ سکتا ہے یعنی ایک طرف سے یعنی کہ غصّہ کہنا چاہئے یا نفرت کہنا چاہئے، یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے، تو اِس کے لئے زیادہ صحیح یہ ہوتا ہے کہ اُس کا صرف تجربہ کیا جائے۔ باقی عام طور پر دوسرے مسلمانوں کے ساتھ، دین والوں کے ساتھ اور ساتھ یعنی انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے لئے انسانِ کامل کو وہی کچھ کرنا ہوتا ہے، جو دوسرے یعنی کرتے ہیں مگر بڑی پاکیزگی کے ساتھ اور

بہت اُونچے مرتبے میں اور بہت اعتدال کے ساتھ اور بہت یعنی کہ ہر چیز میں صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ۔

آپ نے سُن لیا کہ جو غذا ہے یا جو دَوا ہے وہ محدود نہیں ہے، پھر اُسی مطلب کو میں دُہرانا چاہتا ہوں۔ اگر جڑی بوٹیوں میں دَوا کی تاثیر ہے تو سیر بھر جڑی بوٹیاں یا پاؤ بھر جڑی بوٹیاں نہیں کھلاتے ہیں، کیوں نہیں کھلاتے ہیں؟ کہ اُس میں سے ایک جوہر کو نکال کے ایک چھوٹی سی گولی یا ایک چھوٹی سی کوڑی/ پوڑی کو دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ رُوحانی طبیب اِس کوڑی/ پوڑی سے بھی ایک چھوٹی سی چیز بنائے جس کا نام رُوح ہو اور ہوسکتا ہے کہ وہ کوڑی/ پوڑی خدا کی یاد میں ہو، ذکر میں ہو وہ دَوا شیشی میں ہو، عبادت کی شیشی میں ہو، ذکر کی شیشی میں ہو اور نامِ خدا کی کوڑی/ پوڑی میں ہو۔ یہ ظاہری بات ہے کہ کثرت سے کوئی ذکر و عبادت کرتا ہے تو وہ بہت کم بیمار ہوتا ہے اور اگر ہوتا ہے تو بھی کیا ہوا؟ یہ بحیثیتِ مجموعی دیکھنے سے یہ صحیح ہے کہ کثرت سے عبادت کرنا جو ہے وہ بہت ہی مفید ہے، بہت ہی۔ میں جسم کی بات کرتا ہوں، رُوح کے لئے تو خود مفید ہے، جسم کے لئے بھی عبادت بہت مفید ہے، بہت ہی مفید ہے، تو یہ ہے گفتگو، کثرت سے عبادت کی جائے، ہمیشہ خدا کے نام کو لیا جائے۔ آپ میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ وہ زندگی میں تجربہ کرے، ہفتہ بھر کے لئے خدا کے نام کو کثرت سے لیں، بہت زیادہ، جو عبادت کرنی ہے اُس کو (regular) کریں اور اُس کے علاوہ بھی خدا کے نام کو نہ چھوڑیں، نہ چھوڑیں۔ ایک ہفتے تک کثرت سے خدا کو یاد کر کے دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے اور میرا یقین ہے کہ مومن جو ہے جو مخلص ہے وہ اپنی زندگی کے اندر ایک انقلاب پائے گا اور بہت بڑا فرق پائے گا۔

یہ سوال بہت اچھا ہے۔ اگر کامیاب دُعا کرنی ہے اِس کے لئے یہ یوں ہونا چاہئے کہ جو دُعا ہے وہ بندۂ مومن خود کرے۔ بندۂ مومن خود کرے اگر دُعا کرنے کے قابل ہو، اگر وہ نہیں کرسکتا ہے، وہ بیمار ہے تو یہ لازمی بات ہے کہ دوسرا کرے گا کیونکہ وہ بیمار ہے، ایک یہ صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بیماری کچھ ایسی ہے کہ آدمی ٹھیک ہے بیماری تو ہے لیکن وہ بیٹھ سکتا ہے، سُن سکتا ہے تو اُس کے لئے اگر اُستادِ کامل ہے تو اُس کو اپنے پاس بٹھائیں اور دُعا کچھ اِس طرح سے کرے کہ دُعا کے اندر اُس کی رُوح کو جگانے کی تاثیر ہو یعنی مناجات ہو اور ایسے الفاظ ہوں کہ وہ جو سامنے بیٹھا ہے جو مریض ہے اُن تمام لفظوں کو، اُن تمام باتوں کو بنیاد سے سمجھے اور یہ باتیں اُس کے دل میں چُبھ جائیں پھر اُس کو ایک درد پیدا ہو جائے۔ کون سا درد؟ یعنی یا تو توبہ کا درد، یا تو عشقِ الٰہی کا درد یا عبادت میں جو سستی ہوئی ہے اُس کے متعلق ندامت، پشیمانی کا درد یا خدا کی طرف رُجوع کرنے سے متعلق شوق کا درد، ایسا درد پیدا ہو اور اُسی درد میں وہ آنسو بہائے۔ تو یہ ایک ایسی دُعا ہوئی کہ اِسی کے اندر توبہ بھی ہے، اِسی کے اندر عبادت بھی ہے، اِسی کے اندر اُس کی ذاتی دُعا بھی ہے تو دو دُعائیں ہوگئیں۔ ایک یہ اُستادِ کامل دُعا کرتا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ یعنی اصل جو دُعا ہے وہ وہاں سے قبول ہو گی۔ اِس واسطے وہ چُبھنے والی باتیں کرتا ہے اِس کے دل میں چُبھتی ہیں تو وہ رو پڑتا ہے، آنسو آنے لگتے ہیں۔ اِس

صورت میں یہاں سے نہیں وہاں سے وہ دُعا قبول ہو جائے گی اور ابھی اُس نے نہ صرف دُعا کی بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ یہ مناجات بھی ہے، یہ خصوصی عبادت بھی ہے اور یہ توبہ بھی ہے اور یعنی کہ عاشقانہ فریاد بھی ہے اور بہت کچھ ہے اور ہم اِس کا جو بھی نام رکھیں حالانکہ حقیقت میں اُس کے بہت سے نام ہیں، تو یہ ایک ایسی چیز بنے گی اُس وقت رُوح کامیاب ہو جائے گی اور خداوند چاہے تو ایک ایسی کامیاب دُعا سے کسی کی تکلیف کو دُور بھی کر سکتا ہے، کسی کو رُوحانی ترقّی بھی دے سکتا ہے۔ دُعا ہو تو ایسی ہونی چاہئے اور جہاں آنحضرتؐ سے متعلّق یعنی یہ روایت ہے، یہ ایک جنرل بات ہے جو سب مسلمانوں کو قرآن کی طرف اور الحمد کی طرف رُجوع کرانے کے لئے فرمایا گیا ہے اور یہ رُجوع صحیح معنوں میں ہے، صحیح طور سے ہے۔ میں کبھی وہ کتاب، جو روایت پڑھوں گا وہ بہت مستند اور معتبر ہدایت ہے، دعائم الاسلام جیسی کتاب میں یہ ہے، تو دُعا ایسی ہو، اگر آپ سے کوئی کہتا ہے کہ میرے لئے دُعا کریں اور آپ کے پاس وقت ہے تو اُس کو بٹھانا، اگر اچھا مومن ہے تو اُس کو بٹھانا۔ بٹھا کے اُس کے لئے سب سے پہلے یعنی اِس دُعا کے بہانے سے دین کی باتیں کرنا۔ اُس سے کہنا کہ جماعت خانے میں جائیے کہ وہ یعنی خدا کا گھر ہے، وہاں آپ کی دُعا قبول ہو گی۔ پھر کہنا کہ آپ جماعت خانے میں جا کر اچھی طرح سجدہ کرنا اور پیشانی کو جھکا کے سجدہ کے اندر یعنی کہ دُعا کرنا۔ یہ سکھانا کہ جماعت خانے میں جتنے مومنین ہیں اُن مومنین کے متعلق آپ یہ کہنا کہ خداوند جتنے مومنین اِس تیرے مقدّس گھر میں بیٹھے ہیں اِن کی حُرمت سے ہماری فلاں فلاں حاجت کو قبول فرمانا، یہ اُن کو سکھانا۔ اِس طرح جتنا (time) آپ دے سکتے ہیں اُن تمام یعنی کہ منٹوں میں جو ہے نا ایسی تعلیم دینا کہ وہ دین سے ہمیشہ کے لئے منسلک ہو جائے اور خدا کے نام کو ہمیشہ لے، تو میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ دُعا ہے یا نصیحت ہے یا مناجات ہے یا علم ہے، تو بہت کچھ ہے اور ساری چیزیں ہیں اِس میں، تو ایسا ہوتا ہے اور اِس طریقے سے کامیابی ہوتی ہے۔ بہت بڑی۔

سوال: صاحب! جو چھوٹا بچّہ ہوتا ہے، وہ گریہ وازری نہیں کر سکتا ہے، وہ کس طرح دُعا کر سکتا ہے؟ جواب: اُس کے لئے جو والدین ہیں، جو وارثین ہیں وہ کام کر سکتے ہیں۔ اِس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ یعنی ہر حالت میں ڈاکٹری کے اُصول کو اور اِن چیزوں کو چھوڑ کے دُعا پر لگ جائیں۔ یہ دُعا کا فائدہ کسی خاص مومن کو ہو سکتا ہے اور ہر شخص دُعا کے فائدے کو نہیں لے سکتا ہے۔ اس لئے کہ خداوندِ عالم نے دُنیا کے اندر جو چیزیں بنائی ہے جو ڈاکٹری ہے، جو سائنس ہے، وہ (generally) رحمت ہے سب لوگوں کے لئے۔ اِس لئے امام کے حضور میں کوئی ایسا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو مولا فرماتے ہیں کہ تم فلاں ڈاکٹر سے رُجوع کرو تو امامؑ لوگوں کو مشکلات کی طرف رہنمائی نہیں کرتے ہیں، جو عام سطح ہے تو عام سطح کے مطابق (guidance) کرتے ہیں یہ تو یعنی اتفاقاً ایک بات نکلی کہ دُعا میں کوئی اثر ہے یا نہیں ہے؟ ہے اثر۔

ٹرانسکرائب: شمع گیلانی ٹائپ: سیما عظیم علی نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان
عنوان: صوفی ابن الوقت ہوتا ہے، نفس امّارہ
کیسٹ نمبر: ۶۲   تاریخ: ۱۵۔جنوری۔ ۱۹۸۲ کراچی

Click here for Audio

آپ سب عزیزان اپنے خداوند کے حضور میں ہاتھ اُٹھا کے دُعا مانگیں، دل ہی دل میں مناجات کریں، مولا سے معجزانہ تائید، رُوحانی قوت طلب کیجئے۔ وہ برحق مولائے حیّ و حاضر ہے اور آپ کی خاطر خواہ مدد کرسکتا ہے، وہ آپ کو نواز سکتا ہے، آخر اُس کے پاس جو بے پناہ رحمت کے خزانے ہیں اُن کا بھی تو کوئی تقاضا ہے۔ رحمت کو بھی، رحمت کو بھی، رحمت کو بھی کوئی کارنامہ چاہیئے، کوئی کارگزاری چاہیئے۔ ہمیں چاہیئے کہ کوئی کام کر دکھائیں ورنہ وہ کیا رحمت ہے، رحمت مومنین کے لئے ہے، رحمت اُن کے لئے ہے، جن کی کوئی خودی نہیں، جن کی کوئی انا نہیں، جو بار بار فنا ہو جاتے ہیں، جو خوب پگھل جانا جانتے ہیں، جو ہر بار نیستی اور فنا کے سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں یا وہیں پر ڈوبے رہتے ہیں۔

اے عزیزانِ من! آپ یقین مانیے کہ فنا سب سے بڑی چیز ہے یعنی ہم اپنی خودی کو چھوڑیں۔ جس انا سے ہم وابستہ ہیں، جس انا سے ہم منسلک ہیں اُس کے بندھنوں سے ہم الگ ہو جائیں اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے لیکن کیا کیا جائے؟ کس طرح عاجزی کو اپنائیں؟ کس طرح اپنی حاجتوں کو سمجھیں؟ دُنیا سے لے کر آخرت تک جو ہماری حاجتیں ہیں یا جو ہمارے سامنے مشکلات ہیں یا جو ہم کرنا چاہتے ہیں اور نہیں کرسکتے ہیں اِس کا ہم کو احساس ہونا چاہیئے یا یہ ہو کہ ہم خداوندِ عالم کی بے پناہ رحمت کا تصوّر کریں، اُس کی نوازشات کا تصوّر کریں کہ اُس نے اپنی بادشاہی میں کتنے لوگوں کو نوازا، برتری اور ترقّی دی اور بزرگانِ دین اور ہمارے عالی قدر پیر جو ہو گزرے ہیں اُن پر کیسی نوازشات ہوتی رہتی تھیں۔ ہم البتہ کمزور ہیں، ہم البتہ یہ اہلیت نہیں رکھتے ہیں، نہیں تو اُس کی نوازش کے لئے کیا دیر ہوسکتی ہے؟ کوئی دیر نہیں، جب وہ دُور نہیں ہے اور ہر کام کیا ہوا ہے تو اُس کی رحمتوں کے لئے کیوں تاخیر ہو؟ کیوں دیر ہو؟ اور اگر دیر ہے تو وہ بھی ہماری وجہ سے ہے، ہماری کوتاہیوں کے سبب سے ہے۔

اے عزیزانِ من! دُنیا میں دین کو اپناتے ہوئے جو مومنین ہیں اور اُن میں جو دانشمند ہیں وہ ہر وقت عجز و انکساری کی قدر کرتے ہیں، عجز و انکساری کو اپناتے ہیں اور مولا کے حضور میں گڑگڑاتے ہوئے دُعا مانگتے ہیں، وہ آنسوؤں کی بارش کے درمیان رہتے ہوئے دُعا مانگتے ہیں، تب ہی تو خداوند ایسی عاجزانہ دُعا کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔

اے عزیزانِ من! مجھے احساس ہے کہ آپ اِس چھوٹی سی محفل میں اِس لئے آئے ہیں کہ یہاں سے کوئی چیز حاصل ہو، رُوحانیت کا کوئی موتی ملے، کوئی پھول ملے، کوئی پھل ملے۔ اِس لئے اِس باغ میں آپ آئے ہیں اور بیشک آپ کا یہ خیال صحیح ہے لیکن کیا کیا جائے؟ سب سے پہلے جو ہم سب کے سامنے رُکاوٹ ہے وہ ہماری اپنی خودی ہے، اِس خودی سے ہم کس طرح دست بردار ہو جائیں؟ خودی کے خول سے ہم کیسے باہر نکلیں؟ ریشم کے کیڑے کو آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے لئے ایک خول بناتا ہے، جب تک وہ اِس خول سے باہر نہیں نکلتا تو ہَوا میں پرواز نہیں کر سکتا ہے اور کیڑے کی صورت سے بدل کر پرندہ نہیں بن سکتا۔ خول سے، خودی کے خول سے نکل جانے کے ضرورت ہے، خودی کے خول سے نکل جانے کی ضرورت ہے۔

اے عزیزانِ من! اِس وقت کو غنیمت سمجھ لینا اور غنیمت یہ کہ پھر بار بار یہ موقع میسّر نہیں آئے گا، ایسی سعادت بہت کم نصیب ہوتی ہے، ہوشمند مومن کو چاہئے کہ وہ وقت سے فائدہ اُٹھائے۔ کسی نے کہا ہے کہ صوفی جو ہوتے ہیں وہ اِبنُ الوقت ہوتے ہیں یعنی وہ وقت کی قدر کرتے ہیں یا وقت پرست ہوتے ہیں، موقع شناس ہوتے ہیں۔ اِس معنیٰ میں کہ پھر وقت میں جو سعادت سامنے آتی ہے، جو نیک بختی میسّر آتی ہے اُس کے دوبارہ آنے کی کوئی ضمانت نہیں، آ بھی سکتی ہے اور نہیں بھی آ سکتی ہے۔ اِس کے لئے وقت کو صوفی لوگ غنیمت سمجھتے ہیں اور وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، تو آپ بھی درویش ہیں، صوفی ہیں، صوفی کوئی معمولی لفظ نہیں ہے، اچھا لفظ ہے گو کہ صوفی اہلِ طریقت ہیں لیکن اُن سے ہم اچھی اچھی مثالیں لے کے دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں۔

اے عزیزانِ من! اب یہ مسئلہ بھی ہے کہ ہم کچھ وقت کے لئے آپ سے دُور ہو جائیں گے۔ میں اِس بات کو بھی سامنے رکھتا ہوں، ہم قلبی کیفیتوں میں ایک دوسرے سے دُور نہیں ہیں، تصوّرات میں، خیالات میں، نظریات میں لیکن پھر بھی ہم جسمانی طور پر ایک دوسرے سے دُور ہوں گے۔ تب میں اِس محفل کو یاد کروں گا، ضرور یاد کروں گا اور ہر فرد کو یاد کروں گا۔ ہر فرد کی عبادت کو، اُس کی شرافت کو، اُس کی فضیلت کو، اُس کے آنسوؤں کو میں یاد کروں گا، اُس کی خدمت کو یاد کروں گا، اُس کی کوششوں کو یاد کروں گا اور شاید بلکہ یقیناً آپ بھی ایسا ہی کریں گے۔ اِس کے لئے کیا یہ غنیمت نہیں ہے کہ ہم وقت سے فائدہ اُٹھائیں اور کچھ قدم آگے بڑھیں۔

عزیزانِ من! کچھ قدم آگے اِس طرح بڑھ سکتے ہیں کہ ہم باطنی طور پر اپنے سفر کو جاری رکھیں، جدوجہد کریں اور دیکھیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو ہر بار ہمارے لئے باعثِ رُکاوٹ بن جاتی ہے، وہ نفسِ اِمّارہ ہے جس کے متعلّق آپ بہت کچھ جانتے ہیں، نفسِ اِمّارہ اور یہ اندرونی دشمن ہے۔ اے افسوس! ہر شخص اپنے اِس دشمن سے بے خبر ہے اور اِسی طرح ہم میں سے ہر ایک اِس گھر کے چور سے بے خبر ہے، یہ ہمارا کیا نقصان کراتا ہے ہم سوچتے نہیں ہیں۔ یہ دشمن دوست نُما ہے یعنی ایسا دشمن کہ وہ دوست کے رُوپ میں ہے۔ یہ بھیڑیا ہے مگر بکری لگتا ہے اور شیطان کا نمائندہ اِس کے سوا اور کون

ہے؟ لیکن ہم نے اپنی زندگی کے عزیز اوقات کو اِس کی غلامی میں صرف کیا ہے، یہ بات باعث اِفسوس ہے۔ کاش! کاش! ہم ہر وقت مولا کو یاد کرتے، مولا کو اِس حد تک یاد کرتے کہ یاد کرتے کرتے مولا کے نام سے، مولا کی یاد سے ہم کو خوشبو آنے لگتی، لذّت و شادمانی میسّر ہو جاتی، ذکر میٹھا لگتا، نامِ خدا بھاری نہیں لگتا اور اِس سے ہماری بہت سی مشکلات آسان ہو جاتیں، اے کاش! اِس حد تک ہم خداوند کو یاد کرتے۔ یہ کام ہم سے کب ہوگا؟ اے مومنین! اِس زندگی سے فائدہ اُٹھانا ہے، ایسا نہ ہو کہ کل کو ندامت اُٹھانی پڑے گی، اِس لئے جو وقت باقی ہے، زندگی کی اِس مہلت میں سے اِس باقی ماندہ وقت سے خوب فائدہ اُٹھانا، خوب فائدہ اُٹھانا۔ نرمی سیکھو، عاجزی سیکھو، فنا سیکھو، بے خودی سیکھو اور عاجزی سیکھو۔

عزیزانِ من! یہ کام اِس قدر مشکل ہے کہ ایک ہی دن میں یہ انجام نہیں پا سکتا۔ اِس کے لئے بہت کچھ مولا کی دست گیری چاہئے، آپ اپنی عادتوں کو کچھ اِس طرح سے بنائیے کہ ہر بار مولا سے یاری چاہیں۔ کام اگر چھوٹا ہے تو بھی یاری چاہنا کہ اُس کی یاری کے بغیر کوئی کام حُسن و خوبی سے انجام نہیں پاتا۔ یادِ الٰہی کے بغیر کوئی چیز مزہ نہیں دیتی۔ اِس کے لئے آپ اپنی عادت کو اِس طرح سے اپنائیے کہ بار بار خداوند سے یاری طلب کریں، مدد چاہیں، عبادت میں بھی، دُنیا کے کاموں میں بھی، حتیٰ کہ سونے جاگنے میں بھی، اُٹھنے بیٹھنے میں بھی اور پانی کے ایک گھونٹ کو بھی اُس کی یاری کے بغیر نہیں پینا اور کھانے کے ایک لقمے کو بھی خداوند کی یاد کے بغیر نہیں لینا۔ کیا معلوم اِس پانی کے قطرے سے نقصان ہو، کیا معلوم اُس لقمے سے ضرر ہو اور اُس کے کھانے سے کوئی تکلیف، کوئی بیماری ہو۔ لہٰذا خوفِ خدا یہ ہے کہ ہم اُس کے نام کے بغیر نہ رہا کریں، اُس کا نام کوئی بھاری نہیں ہے، اُس میں کوئی تلخی نہیں ہے، اُس میں شیرینی ہی شیرینی ہے۔ ایک عاشق کی زبان پر نامِ خداوند ہو، مولا کا پیارا نام عاشقوں کی زبان پر، مومنین کی زبان پر اور خداوند کے سچّے بندوں کے دل میں خداوند کا نام ایک نور ہے، ایک روشنی ہے، لذّتوں کا سرچشمہ ہے، حلاوتوں کی کان ہے، وہ شہد و شکر جیسا ہے۔

اِس کے لئے ہم میں سے اگر کوئی خداوند کے نام کو فراموش کر جاتا ہے تو یہ اُس کی بدقسمتی ہے، بدبختی ہے کیونکہ خداوند کے نام میں بہت بڑی حکمتیں اور بہت ساری برکتیں سموئی ہوئی ہیں۔ اِس لئے شب و روز خداوند کے نام کو وردِ زبان بنایا جائے، خداوند کے مبارک نام کو اور کسی وقت بھی یادِ الٰہی سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔ ایسی جب عادت ہو گی تو دین و دُنیا کی کامیابی مومن کے قدموں کو چومے گی، کامیابی! کامیابی! خداوند کے نام میں یہ تاثیر ہے کہ اِس سے مومن پگھل جانا سیکھے گا، اِس سے اُس کو ایک حرارت ملے گی، ایک گرمی، ایک تپش، ایک حلاوت، ایک لذّت اور دل و دماغ میں بے انتہا سکون، ہدایت کی روشنی، توفیق، عالی ہمّتی، اولوالعزمی۔ اِس سے نہ صرف دین کے کاموں میں مدد ملے گی بلکہ اُس کے دُنیا کے سب کام بھی آسان ہو جائیں گے۔ جیسا کہ آپ کو یہ قصّہ یاد ہے کہ جب حضرت فاطمہ زاہرہ صلوۃ اللہ علیہا نے اپنے پدرِ گرامی یعنی رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ایک کنیز کی درخواست کی تو سرورِ انبیاء رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم

نے کیا ارشاد فرمایا؟ کیا آپ نے اُن کو ایک کنیز دی؟ نہیں دی۔ ایک کنیز کی جگہ پر ایک تسبیح دی، تو دیکھئے سوال کیا تھا اور جواب کیا ملا، کیا چیز مطلوب تھی اور کیا چیز دی گئی۔ جہاں فاطمۃ الزہرہ علیہا السّلام کو کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے ایک کنیز کی ضرورت تھی کیونکہ آپ کام کاج میں جسمانی طور پر بہت تھک جاتی تھیں تو وہاں رسولِ خداؐ نے ایک تسبیح کیوں دی اور اِس میں کیا حکمت ہے؟ آخر سوال اور جواب کے آپس میں ربط تو ہونا چاہئے، تو کیا یہ تسبیح رُوحانی طور پر فائدہ دلانے کے علاوہ جسمانی طور پر ایک کنیز کا کام بھی کر سکتی تھی؟ ہاں! یہ نہ ہوتا تو آنحضرتؐ ایسا نہ فرماتا اور ایسا نہ کرتا۔

حکمت اِس میں یہ ہے کہ مومن جب عبادت و بندگی میں پگھل جاتا ہے تو اُس کے دل و دماغ سے ساری آلائش اور کُدورت، بے چینی اور غیر سکونی کیفیّت اور دیگر کمزوریاں اور تاریکیاں دُور ہو جاتی ہیں اور نتیجے کے طور پر مومن کا کام باسلیقہ ہو جاتا ہے اور جو بھی وہ کام کرتا ہے دُرست کام کرتا ہے اور کام کے کرنے سے اِس کو سکون ملتا ہے۔ آپ ضرور اِس فلسفے کو قبول کریں گے کہ کام کے کرنے کا نتیجہ دو طرح سے نکلتا ہے، ایک یہ کہ کام کے کرنے سے کوئی انسان بیزار ہو جاتا ہے، (bore) ہو جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ کام کے کرنے سے کوئی انسان خوش ہو جاتا ہے، اُس کو سکون ملتا ہے، یہ کیوں؟ تو یہ محض ایک ذہنی کیفیّت ہے، ایک دماغی کیفیّت ہے۔ کام تو دونوں تھے، جس سے (bore) ہوا وہ بھی اور جس سے خوشی حاصل ہوئی یہ بھی، پر اِن دونوں کاموں میں جو فرق ہے کہ ایک سے خوشی اور دوسرے سے بوریت یہ کیوں؟ یہ اِس لئے کہ دماغ کی کیفیّت میں فرق ہے، تصوّر میں فرق ہے، احساس میں فرق ہے۔ اب احساس کو، شعور کو، قلبی کیفیّت کو دُرست کرنے کے لئے کیا چاہئے؟ دین کا فلسفہ چاہئے یا یہ کہ خداوند کے نام کو پڑھا جائے کہ اُسی کے اندر ایک لاشعوری کیفیّت کا فلسفہ موجود ہے۔ نامِ الٰہی میں ایک ایسی ہدایت ہے کہ جس کی کوئی آواز نہیں، ایک ایسا علم ہے کہ وہ ظاہر نہیں، ایک ایسی روشنی ہے کہ وہ نظر نہیں آتی، وہ بہت ہی پوشیدہ کیفیّت ہے، تو بندۂ مومن جب کثرت سے خدا کو یاد کرتا ہے، یاد کرتا ہے، یاد کرتا ہے تو میں سچ کہتا ہوں کہ اُس کے دُنیوی کام کے کرنے میں بھی مزہ ہوتا ہے، اُٹھنے میں بھی، بیٹھنے میں بھی، چلنے میں بھی، پھرنے میں بھی تو اُس کے سارے احساسات خوش گوار ہو جاتے ہیں، اُس کے دل کے اندر شکر گزاری کا جذبہ اُبھرنے لگتا ہے، مایوسیاں اور تلخیاں اُس سے آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں۔

اِس کے برعکس ایک بندہ ہے جو ناشکرا ہے جس نے خدا کے نام کی حکمت کو نہیں سمجھا تو وہ کام کرتا ہے تو اُس کے ساتھ ساتھ اُس کا سر پھر جاتا ہے، چکّر آنے لگتا ہے، غصّے سے بھر جاتا ہے، کیوں؟ کس لئے؟ یہ اِس لئے کہ دل کے دو کان ہیں اور اُن دو کانوں کے قریب دو مخلوق ہیں، ایک تو شیطان ہے اور ایک فرشتہ ہے۔ دونوں جھانک رہے ہیں، دل کی کیفیّت کو دیکھ رہے ہیں، شیطان بھی، فرشتہ بھی دل کی کیفیّت اچھی ہے اور نامِ الٰہی کا نتیجہ ہے اُس میں تو فرشتے کو کچھ کہنے کے لئے موقع ملتا ہے۔ وہ آہستہ آگے بڑھتا ہے، مومن کے دل کے کان سے قریب ہو جاتا ہے اور سرگوشی کے انداز میں

(whispering) کرتا ہے، اچھی اچھی اُمیدیں اور سچّی سچّی باتیں۔ گو کہ یہ سنتا نہیں ہے لیکن وہ فرشتہ اچھی اچھی باتیں، اچھی اچھی اُمیدیں اُس کے دل میں بھر دیتا ہے اور جب کوئی شخص خدا کے نام سے غافل ہو جاتا ہے تو اُس وقت وہ شیطان جو اِس پر تعینات تھا، موقع پاتا ہے، آگے بڑھتا ہے اور کان میں سرگوشی کرنے لگتا ہے اور مایوسیاں، غم، غصّہ اور ایسی بہت رَذِیل چیزیں اُس کے قلب کے اندر بھر دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ دُنیا کے اندر دو قسم کے لوگ ہیں اور خود ایک انسان بھی دونوں کیفیتوں میں تجربہ کر سکتا ہے، کبھی یہ کبھی وہ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو کہ اِس فرشتے سے ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کیا آپ نے جماعت میں، معاشرے میں کسی ایسے مومن کو نہیں دیکھا جو نمونہ ہے ایمان میں، اخلاق میں مثالی حیثیّت رکھتا ہے، ہمیشہ اُس کے چہرے پر اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کھلتی ہے اور یہ مسکراہٹ ایمان سے متعلّق ہے، صبر و استقلال سے متعلّق ہے، اخلاق سے بھرپور ہے اور ایمان کے جذبات سے بھرپور ہے۔ کیا آپ نے ایسے مومن کو نہیں دیکھا ہے کہ وہ اخلاق کا نمونہ ہے اور ہر وقت خوش و خرّم رہتا ہے؟ یعنی ایمان کے طور پر اور اخلاقی طور پر وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ کسی بھی مومن کے سامنے وہ منہ بنا کے نہ بیٹھے اور اُس کے چہرے سے غم و غصّہ کے آثار نمایاں نہ ہوں، وہ اِس کے لئے کوشش کرتا ہے، وہ کوشش نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اِس بات کا عادی بن چکا ہے، وہ (automatically) یہی کرتا ہے، تکلّف کے بغیر کہ اُس نے ایک ایسی عادت اپنائی ہے اور اُس کو استوار کیا ہے۔ یہ سب کچھ ایمان کی بدولت ہے، آپ بصیرت سے کام لے کے دیکھیں، جماعت میں دیکھیں، معاشرے میں دیکھیں، ایسے بہت اچھے افراد آپ کو ملیں گے، پگھلنے والے، نرمی سے بات کرنے والے اور غصّے کو جذب کرنے والے۔ ایسے اچھے بندگانِ خدا آپ کو ملیں گے اور مومن کو بصیرت سے کام لینا ہے، غور کرنا ہے ہر چیز میں اور گہرائی سے مطالعہ کرنا ہے تو اِس سے فائدہ ہوگا کیونکہ ہم کو یہ حواسِ ظاہر اِس لئے دیئے گئے ہیں کہ ہم ایمان کے طور پر اِن سے فائدہ اُٹھائیں، کبھی کائنات میں غور کریں، کبھی اپنی ذات میں غور کریں، کبھی رُوئے زمین پر جو آثارِ قدرت ہیں، اِن میں غور کریں، ہماری عادت یوں ہونی چاہئے اور اگر ہم سطحیّت کو پسند کرتے ہیں تو اِس سے کچھ نہیں ملے گا یعنی ہمیں سطح سے اور سطحی طور پر نہیں دیکھنے کا، ہمیں ہر چیز کو گہرائی سے دیکھنا ہے، تو یہ چند باتیں تھیں جو اتفاق سے بتائی گئیں۔ اب ہم کسی اور بات کے لئے سوچتے ہیں۔

قرآنِ کریم جو دُنیا بھر کے لوگوں کے لئے آسمانی ہدایت نامہ ہے اُس کے ایک پاک ارشاد کے مطابق مومن کا علم اور اُس کا عمل بہت ہی اہمیّت رکھتا ہے اور مومن عالم بالا میں جو پرواز کرتا ہے وہ اُس کی پرواز علم و عمل کی حیثیّت میں ہوتی ہے یعنی انسان اپنے ربّ کریم سے واصل جس طرح ہو جاتا ہے اُس میں مومن کی شخصیّت نہیں جاتی ہے، اُس کا جسمانی وُجود نہیں جاتا ہے، اُس کی کوئی مادّی چیز نہیں جاتی ہے بلکہ اُس کا علم جاتا ہے، اُس کا شعور جاتا ہے، اُس کا عمل جاتا ہے اور علم و عمل کس طرح جاتا ہے؟ کون سا علم جاتا ہے اور کون سا عمل جاتا ہے؟ اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے

کہ: ''مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ جَمِيۡعًا ؕ اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ ؕ ''(۳۵:۱۰) پاک کلمہ خدا کے حضور کی بلندی کی طرح بلند ہو جاتا ہے۔ اس سے مُراد علم ہے یعنی حقیقی علم جو صحیح معنوں میں علم ہے وہ خدا کے حضور کی بلندیوں کی طرف بلند ہو جاتا ہے لیکن کس طرح ہوتا ہے؟ ''وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ ؕ ''اور نیک عمل ایک تخت کی حیثیّت سے اِس پاک علم کو اُٹھاتا ہے، تو اِسی شان سے اور اِسی حیثیّت میں بندۂ مومن کا علم و عمل عالم بالا کی طرف بلند ہو جاتا ہے اور یہی مومن کی انا ہے، مومن کی خودی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح کہا گیا ہے کہ انسان کی دو انائیں ہیں۔ ایک ہے انائے علوی جو ہمیشہ کے لئے اپنے مقام پر ہے، عالمِ بالا میں ہے، ''عِلِّيِّيۡنَ (۸۳:۱۸)'' میں ہے اور مونور یا لزم کے نور میں ہے اور حقیقتِ واحدہ کے طور پر ہے۔ وہ انائے علوی ہے اور مومن کی اِس زندگی سے جو چیز حاصل آتی ہے وہ دو حیثیتوں میں ہے، ایک علم ہے جو یہاں اِس ارشاد میں کلمۂ طیّبہ کہا گیا ہے کیونکہ علم کلمہ ہی ہوتا ہے اور طیّبہ سے مُراد پاکیزگی ہے اور کس قسم کی پاکیزگی ہے؟ یعنی اِس میں شرک کی کوئی آلائش نہیں، ایسا علم ہے کہ جس میں خدا شناسی ہے، ایسا علم ہے کہ جس میں توحید کا تصوّر ہے، ایسا علم ہے کہ جو اعلیٰ ہے اور حقیقی ہے اور جسے کلمۂ طیّب کہا گیا ہے جس طرح سورۂ ابراہیم میں ہے کہ: ''اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ ''(۱۴:۲۴) تو یہ یہاں پاک درخت ہو یا پاک کلمہ ہو تو اِس سے علم مراد ہے کیونکہ جہاں قول اور عمل کا ذکر آتا ہے تو قول علم ہوتا ہے اور عمل، عمل ہوتا ہے۔ لہٰذا اِس آیت میں جہاں دوسری چیز کا ذکر ہے وہ ''عَمَلُ الصَّالِح'' ہے، تو اِس ''عَمَلُ الصَّالِح'' کے ساتھ جو دوسری چیز آنی چاہئے وہ علم ہے۔ لہٰذا علم ہے اور عمل اُسے بلند کرتا ہے۔

اب علم کی تھوڑی سی تعریف ہوئی اور کہا گیا کہ یہ علم عام علم نہیں ہے جسے لوگ علم سمجھتے ہیں۔ اگر لوگوں کی بات مانی جائے تو لوگ جہالت کا نام بھی علم کر سکتے ہیں اور ایسا ہی ہوتا ہے اور لوگوں کی عادت ہے کہ گمراہی کو ہدایت کہتے ہیں اور تاریکی کو نور کہتے ہیں، جہالت و نادانی کو بعض دفعہ وہ علم کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا مومن کو جاننا چاہئے کہ علم سے خدا کی کیا مُراد ہے، کون سا علم؟ وہ علم جو خدا کی نظر میں علم ہے اور صحیح معنوں میں علم ہے یعنی حقیقی علم اور یہاں پاک کہنے کا کیا مطلب ہے کہ جہاں کسی چیز کو پاک کہا جاتا ہے تو اُس سے کسی آلائش کی نفی مُراد ہوتی ہے، تو کلمے میں کس آلائش کی نفی کی گئی ہے یا کس آلائش کی نفی مُراد ہے؟ دیکھیں کہ یہاں توحید کا علم ہے جس میں شرک کی آلائش کی نفی کی گئی ہے یعنی شرک سے پاک، دُوئی سے پاک، کثرت سے پاک علم۔ مُراد توحید کا علم، وہی علم بلند ہو جاتا ہے اور اِس کو کیا چیز بلند کرتی ہے؟ اِس کو ''عَمَلِ صالح''، یعنی نیک کام بلند کرتا ہے۔ اب جو علم کے لئے ایک معیار مقرّر ہوا تو کیا عمل کے لئے کوئی معیار مقرّر نہیں ہونا چاہئے؟ عمل کے لئے بھی معیار ہے، کون سا عمل؟ ''عَمَلُ الصَّالِح'' سے کون سا کام مراد ہے؟ کہ دُنیا کے ہر مذہب میں لوگ کچھ کر کے کہتے ہیں کہ یہ نیک کام ہے، ہر شخص کچھ کر کے کہتا ہے کہ یہ نیک کام ہے لیکن نہیں۔ نیکی کا کوئی معیار ہوتا

ہے جس طرح علم کا معیار ہوتا ہے اور نیکی وہ جو صاحبِ امر اُسے نیکی قرار دے کیونکہ خدا کی طرف سے دُنیا میں ہمیشہ اور ہر وقت کے لئے صاحبِ امر مقرّر ہوتا ہے اور صاحبِ امر کی نظر میں جو کام نیک ہے اور اُس میں نیکی ہے تو وہی نیک کام ہے۔ اگر ہر کوئی اپنے حساب سے اور اپنے معیار سے کسی بھی کام کا نام نیک کام بتا سکتا تو زمانۂ نبوّت میں اہلِ کتاب نے کہا کہ ہم کام کرتے ہیں، ہمارے پاس ایک آسمانی کتاب ہے، ہمارے پاس ایک شریعت ہے، ہمارا قبلہ بھی ہے، ہم خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں پر یقین رکھتے ہیں تو پھر اِس کے علاوہ اور کیا چیز چاہیئے، اُنہوں نے یہ خیال کیا، یہ دعویٰ کیا لیکن خدا نے اُن کے اِس دعویٰ کی تردید کی یہ فرماتے ہوئے کہ: تم جب تلک موجودہ وقت کے پیغمبر کی اطاعت و پیروی نہیں کرو گے تو تمہاری کوئی نیکی قبول نہیں (۴۷:۳۳)۔

اِس سے مومن بہت کچھ نتائج اخذ کر سکتا ہے، چنانچہ صاف بات ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ صاحبِ امر جس نیکی کو نیکی قرار دے اور جس کام کو عملِ صالح فرمائے تو وہ عملِ صالح ہے، وہی عملِ صالح یعنی نیک کام علم کو بلند کرتا ہے، تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ مومن کے سارے اعمال وہ دو حصّوں میں آتے ہیں۔ ایک حصّہ علم قرار پاتا ہے اور دوسرا حصّہ اُس کا عمل ہے اور انسان کو یہ دو صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کا قول ہے، ایک یہ کہ اُس کا عمل ہے، تو قول سے علم مُراد ہے اور عمل سے نیک کام مُراد ہے، تو میں کہہ رہا تھا کہ انسان کی دو انائیں ہیں ایک انا بقائے مستقر کے طور پر نورِ وحدت کے ساتھ ہے یا کہ حقیقتِ واحدہ کے ساتھ ہے اور ایک انا اِس ہستی سے منسلک ہے۔ اب جب علم اور عمل عالمِ بالا کی طرف جاتا ہے تو اُسی میں انائے سفلی جا کر انائے علوی کے ساتھ مدغم ہو جاتی ہے، فنا ہو جاتی ہے۔ ایک مجرّد حقیقت کی حیثیت، کوئی اُس میں مادّہ نہیں، کوئی شئ نہیں، صرف علم اور عمل اور لہٰذا فرمایا گیا حضرت مولانا سلطان محمّد شاہؑ کے ارشاد میں کہ: ''جو خدا کا درجہ ہے اُس تک کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی ہے مگر وہاں تک نیک خیال پہنچ سکتا ہے'' [دارالسلام، ۲۹۔۹۔۱۸۹۹] تو اُس کا یہ مفہوم ہے، اگرچہ میں نے تمام الفاظ کو یاد نہیں کیا لیکن اُس کا خلاصہ اُس ارشاد کا، اُس مقدّس فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ جو رُوحانیت کی بلندی ہے اُس تک کوئی چیز نہیں جا سکتی ہے مگر خیال جا سکتا ہے، خیال سے علم مراد ہے اور عمل ہے، تو یہ ایک لطیف کیفیّت ہے، تو یہی لطیف کیفیّت جا کر، مجرّد حقیقت جا کر انائے علوی میں مدغم ہو جاتی ہے، ایک ہو جاتی ہے، تو وحدت کے ساتھ وحدت کے ایک ہونے میں کوئی دقّت نہیں ہے کیونکہ وحدت کی خاصیّت وحدت ہی ہوتی ہے اور وہ وحدت کے ساتھ ایک ہو جاتی ہے اور چونکہ وہ ازلی طور پر ایک ہے اور درمیان میں جو شعور کا جو پردہ ہوتا ہے جیسے ہی وہ پردہ اُٹھایا جاتا ہے تو ظاہر ہو جاتا ہے، معلوم ہو جاتا ہے کہ دو حقیقتیں بالکل ایک ہو چکی ہیں۔

اِس کے لئے علم کی اہمیّت بہت بڑھ جاتی ہے، اِس آیت میں پہلے علم کا ذکر ہے اُس کے بعد پھر عمل کا ذکر ہے۔ علم پہلے کیوں آنا چاہیئے؟ عمل بعد میں کیوں آنا چاہیئے؟ جہالت و نادانی میں عمل کر کے بعد میں علم پایا جائے تو اُس

سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا، جانور انسان کی نسبت زیادہ محنت اُٹھاتا ہے مگر اُس میں عقل نہیں ہے۔ لہٰذا اُس کو ثواب نہیں ملتا اور اُس کے علاوہ انسان جانور پر بادشاہی کرتا ہے۔ کس طاقت کے بل بوتے پر؟ عقل کے بل بوتے پر اور جو عمل عقل کے بغیر ہو، علم کی روشنی کے بغیر ہو اُس میں کوئی فضیلت نہیں ہے، اُس کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔ آج دُنیا میں جتنے لوگ کسی نہ کسی مذہب سے منسلک ہیں وہ سب اِس خیال سے کہ اُن کا کرنا نیکی ہے، کام کرتے جاتے ہیں۔ کام کرتے ہیں لیکن قرآن میں جتنے تصوّرات ملتے ہیں، جتنی تعلیمات ہیں اُن میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ زیان کار قرار پائیں گے۔ زیان کار کا مطلب کیا؟ زیان کار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دُنیا میں کسی نے کچھ بھی نہیں کیا تھا اور قیامت میں وہ زیان کار کہلایا، یہ بات نہیں ہے۔ زیان کار میں کار فارسی لفظ ہے، زیان بھی فارسی ہے، زیان کار یا کہ خسارہ یا خاسر، خاسر عربی ہے، زیانکار فارسی ہے، زیان کار اسمِ فاعل ہے، تو زیان کار کا مطلب ہے ایسا شخص جس نے دُنیا میں بہت کچھ کام کیا تھا لیکن اُس کا اُس کو کچھ بھی فائدہ نہیں ملا اور زیان کار تجارت کی (term) بھی ہے کہ کسی شخص نے بہت کچھ سرمایہ لگایا پر اُس کو تجارت میں یا کاروبار میں کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا، اُس کو بھی زیان کار کہتے ہیں اور زیان کار نہ صرف تجارت میں، اور دوسرے کاموں میں بھی ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن میں کچھ زیان کاروں کا بھی ذکر ہے بلکہ اکثر و بیشتر یہ تذکرہ آتا رہتا ہے، تو اعمال کے ضائع ہو جانے اور ثواب نہ ملنے کا نام زیان کار ہے۔ اِس لئے یہ بات صحیح ہوئی کہ خدا کی نگاہ میں خدا کی نظر میں جو نیک عمل کا معیار ہے اُس معیار کے مطابق جب کام نہیں ہو پاتا تو اُس وقت وہ جو کام ہے وہ رَد ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا اور اِسی طرح علم بھی، تو علم بھی اور عمل بھی خدا کے معیار کے مطابق ہو، تو اُسی علم میں اور اُسی عمل میں مومن جو ہے عالمِ بالا کی طرف پرواز کر جاتا ہے اور اُس کی جو ازلی انا ہے اُس انا میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ اپنی انا کو خدا پاتا ہے۔ چونکہ جو حقیقت خدا کے ساتھ متّحد ہے وہ خدا ہے تو لیکن اُس حقیقت کی آسانی سے ہم تعریف نہیں کر سکتے ہیں کہ کیوں ایسا ہے کہ وہ ایک حقیقت ہے اور ہزار ہے یا بیشمار ہے، تو خدا کا کام ہی ایسا ہے، اُس کی قدرت ہی ایسی ہے، اُس کی شان ایسی ہے کہ وہ ایک ہو اور سب ہو۔

کبھی ہم نے اِس کا ذکر کیا تھا کہ: ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' (۱۱۲:۱) کا کیا مطلب ہے۔ اِس میں دو باتیں ممکن ہیں یا یہ کہ سب کی نفی ہو اور ایک وُجود کو تسلیم کیا گیا ہو یا ایک وُجود کا اِثبات ہو یا ہے کہ سب حقیقتوں کو ایک کر کے بتایا جاتا ہے، تو یہاں پر یہ دوسری بات ہے اور دوسرا تصوّر صحیح ہے کہ سب حقیقتیں ایک ہیں، اور سب حقیقتیں ایک ہیں اور اِس لئے وہ ایک ہی حقیقت ہے تو اُسی میں مومن کی انائے علوی ہے۔ قرآن میں اگر ہم چشمِ بصیرت سے دیکھیں اور دیکھ سکیں تو ہمیشہ یہ حقیقت سامنے ہوتی ہے کہ فرمایا جاتا ہے کہ: مومن کا اعمال نامہ ''عِلِّيِّيْنَ'' میں ہے (۸۳:۱۸)۔ اب اعمال نامہ سے کیا مُراد ہے؟ مومن یہاں عمل کرتا ہے تو اُس کے اعمال ''عِلِّيِّيْنَ'' میں درج ہوتے ہیں۔ اِس کا کیا مطلب؟ اِس میں اور

اِس تصوّر میں کچھ چندان بُعد نہیں ہے، تو قرآن دو طرح سے نہیں بلکہ کئی طرح سے یعنی تعلیم دیتا ہے سمجھانے کے لئے۔ کبھی تو فرماتا ہے کہ مومن کے اعمال جو ہیں وہ ''عِلِّیِّیْنَ'' میں ہیں، کبھی تو کہتا ہے کہ یہ زمین سے بلند بلند ہو کر جاتے ہیں۔ اِس میں کوئی فرق نہیں ہے، یہاں سے عالمِ بالا میں جاتے ہیں تب عالمِ بالا میں وہ اعمال نامہ ہے، تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ مومن کی دو انائیں ہیں، ایک انا عالمِ بالا میں ہے جس کا قرآنی نام ''عِلِّیِّیْنَ'' ہے۔ ''عِلِّیِّیْنَ'' بلندی کو کہتے ہیں اور ''عِلِّیِّیْنَ'' امام کا درجہ ہے جو علیؑ زمانؑ ہے، جو علیؑ کی اولاد ہے، وہی عالمِ بالا ہے، اُس کی مرتبت، اُس کا درجہ بہت بلند ہے۔ لہٰذا وہ عالمِ بالا کہلاتا ہے کیونکہ عالمِ بالا کوئی مادّی دُنیا نہیں ہے، وہ ایک رُوحانیت کا مرتبہ ہے اور رُوحانیت کا وہ مرتبہ امام کا مرتبہ ہے اور اُسی امامؑ میں مومن کی انائے علوی ہے جو پہلے سے ہے۔

جب ہم مانتے ہیں کہ ہم خدا سے آئے ہیں، ٹھیک ہے ہم خدا سے آئے ہیں، تو اُس کی کچھ (originality) وہاں موجود ہونی چاہئے یا کوئی سایہ ہونا چاہئے یا کوئی نقش ہونا چاہئے یا کوئی ریکارڈ ہونا چاہئے یا کوئی تصویر ہونی چاہئے۔ دُنیا کے لوگ کسی بھی آفس سے کسی کاغذ کو، کسی خط کو، کسی (circular) کو، کسی حکم نامے کو جاری کرتے ہیں تو اُس کی کاپی تو ضرور رکھتے ہیں۔ یہ دانشمندی نہیں ہے کہ جو چیز جہاں سے روان ہوتی ہے، بھیجی جاتی ہے، اُس کا کوئی نشان تک وہاں موجود نہیں۔ ہم عالمِ بالا سے آئے ہیں یا خدا سے آئے ہیں تو ہمارا کچھ وہاں نشان موجود ہونا چاہئے، کوئی تصویر ہونی چاہئے، کوئی ریکارڈ ہونا چاہئے، کوئی (originality) ہونی چاہئے اور یہ جو (originality) ہوگی زندہ ہوگی۔ دُنیا کے کسی آفس سے کوئی کاغذ جاری ہوتا ہے، تو وہ کاغذ ہی ہوتا ہے جو خاموش ہوتا ہے جو مردہ ہوتا ہے جو بولتا نہیں ہے، لیکن رُوح جہاں ایک زندہ حقیقت ہے تو اُس کا ریکارڈ بھی زندہ ہونا چاہئے۔ ہم نے اُس ریکارڈ کا نام اپنے محاورے کے طور پر اُس حقیقت کا نام انائے علوی دیا، انائے علوی پتا ہے۔ اُس ریکارڈ کو ہم نے انائے علوی کہا، تو یہ ایک (logic) ہے جو میں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ہم خدا کے حضور سے آئیں ہیں تو وہاں پر کوئی ہونا چاہئے۔ کیونکہ دُنیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی کہیں سے کہیں جاتا ہے تو اُس کے کم سے کم نقشِ پا ہوتے ہیں، اُس کے جانے کا پتا چلتا ہے، تو پھر جہاں سے وہ اُٹھا ہے وہاں بھی کوئی چیز پائی جاتی ہے لیکن وہ جو خداوند، جو اُس کے ہر کام میں قدرت ہے، اُس کے ہر کام میں حکمت ہے تو اُس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم جہاں سے آئے ہیں وہاں پر ہماری ایک تصویر ہو لیکن وہ تصویر زندہ ہوگی اور ایک بولنے والی تصویر ہوگی۔ چونکہ وہ تصویر اِس سے اعلیٰ ہوگی کیونکہ وہ عالمِ رُوحانیت ہے، کہ ہر چیز جس مقام پر ہوتی ہے اُس مقام کے ماحول کے مطابق ہوتی ہے کہ اگر ہم رُوحانیت میں ہیں تو اُس میں اعلیٰ ہیں اور جہاں جسمانیت میں ہیں تو جسم کی وجہ سے ہم ادنیٰ ہیں اور جب ہم خدا کے حضور میں تھے تو اُس وقت ہماری حقیقت بہت ہی تابناک تھی، تو اس لئے ہمیں اپنی انائے علوی پر یعنی اپنی اُس (super-self) پر یقین رکھنا چاہئے تو ہمارے اعمال جو منتقل ہو جاتے ہیں اُس انا کی طرف اور ہم

اُس انا میں خود کو خدا سے واصل پاتے ہیں۔ ہم اپنے محاورے کے طور پر یہ بھی کہتے ہیں اور دُعا بھی کرتے ہیں کہ اصل سے واصل ہو جائیں۔ یہ بات اِس انا کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن جہاں وہ انا ہے اُس میں ہم پہلے سے البتہ واصل ہیں، پر فرق کیا ہے؟ فرق شناخت ہے، فرق جاننے کا ہے۔ فرق جاننے کا ہے، اِس جاننے کی دیر ہے اور جاننے کی تاخیر ہے اور اِسی کی ضرورت ہے، تو اِس لئے انسان کی اپنی معرفت کی اہمیّت بتائی گئی ہے: ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ'' پر جب آپ غور کریں گے تو انسان کی رُوح کی بہت بڑی اہمیّت کا پتا چلے گا کیونکہ یہاں اپنی شناخت، انسان پر واجب کر دی گئی ہے اور اِس کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور اِس کا فلسفہ کچھ یوں ہے کہ جو اپنی رُوح کو پہچانتا ہے تو اِس کی رُوح پروردگار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ مطلب اِس سے انائے علوی ہے، مطلب اِس سے یہ بتانا ہے کہ ہم ایک مقام پر خدا کے ساتھ پہلے ہی سے واصل ہیں۔

کبھی ہم نے قرآن کے سلسلے میں یہ ذکر کیا تھا کہ اگر یہ مانا جائے کہ قرآن قلمِ الٰہی میں تھا سب سے پہلے جس طرح کہ دُنیا کے کسی کاتب کی تحریر سب سے پہلے اُس کے ذہن میں ہوتی ہے، اُس کے بعد اُس کے قلمی حرکت میں ہوتی ہے یہ تحریر اور پھر وہ لکھتا ہے، تو اِسی طرح قرآن خدا کے (pen) میں، قلم میں تھا، تو خدا نے یعنی عقلِ کُل کے قلم سے قرآن کو تحریر کیا لوحِ محفوظ پر۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قلم کا وُجود قرآن سے خالی ہو گیا؟ نہیں! جب لوحِ محفوظ سے قرآن دُنیا میں نازل ہوا تو لوحِ محفوظ خالی نہیں ہوئی، لوحِ محفوظ پر بھی صحیح ہے۔ اِس کی مثال ہم نے یہ دی تھی کہ ایک شخص کوئی خط لکھتا ہے یا (subject) بناتا ہے اپنے ذہن سے تو کیا اُس کا ذہن اِس مضمون سے اور اِن افکار سے، اِن خیالات سے خالی ہو جاتا ہے اِس لئے وہ لکھ سکتا ہے؟ نہیں! کوئی بھی رُوحانی چیز اپنی جگہ کو نہیں چھوڑ سکتی ہے، اُس کا (shadow) آتا ہے، اُس کا سایہ دُنیا میں آتا ہے۔ اِس طرح ہم جو دُنیا میں آ گئے تو (shadow) کے طور پر آ گئے، مادّی چیز کہیں دوسری جگہ جانے کے لئے اپنی جگہ کو چھوڑتی ہے، اِس کے برعکس جو رُوحانی چیزیں ہیں وہ اپنی جگہ کو نہیں چھوڑ سکتی ہیں۔ وہ بسیط ہوتی ہیں تو اُن کے دُنیا میں آنے کے لئے ایک جسمانی سایہ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ جیسے ہی کسی رُوحانی چیز نے جسمانی سایہ اختیار کیا تو گویا کہ یہ دُنیا میں آ گیا۔ اِس کو دُنیا میں آنا کہتے ہیں اور اِن کو (return) کرنے کے لئے کیا کرنا ہوتا ہے؟ اِن کو (return) کرنے کے لئے بس یعنی یہ تعلق جو ہے، جو اِنسلاک ہے، جو وابستگی ہے اِس کو چھوڑیں تو یہ چیزیں خود کو یکا یک عالمِ بالا پر پاتی ہیں۔ اِس پر بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے، جاننے کی ضرورت ہے مومن کو کہ [وہ] کس طرح آتا ہے دُنیا میں اور کس طرح جاتا ہے۔ جب تک مومن اِس کو اچھی طرح سے نہیں سمجھتا ہے تو رُوح کی شناخت میں کافی رُکاوٹیں ہو سکتی ہیں۔ ہم نے اِس سلسلے میں کافی مثالیں مادّی چیزوں سے دی تھیں وہ بہت عمدہ مثالیں تھیں۔ مثال کے طور پر ریڈیو اسٹیشن کو لیجئے یا ٹی۔ وی۔ اسٹیشن کو لیجئے، آپ کے (set) پر آواز آتی ہے یا (picture) آتی ہے تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ اسٹیشن

سے اصل مقام سے یہ چیز کٹ کر آتی ہے بلکہ یہ چیز وہاں پر بھی موجود ہے۔ یہاں اُس کا ایک (shadow) پڑتا ہے، اُس کا ایک (image) متشکل ہو جاتا ہے لیکن اصل چیز اسٹیشن پر ہے اور ہم ایک طرح سے اپنی انائے علوی تک علمُ الیقین کے طور پر پہنچ چکے ہوں گے، تو میں اِسی گفتگو کے اِس مقام پر میں رُکتا ہوں۔ اگر آپ عزیزوں میں سے کسی کا کوئی اِس سلسلے میں سوال ہو تو بیشک وہ پوچھا جا سکتا ہے۔ شکریہ، مہربانی۔

ٹرانسکرائب: یاسمین لاسی ٹائپنگ: ثناء وزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: قصۂ آدم کی حکمتیں

کیسٹ نمبر: ۶۳ تاریخ: ۲۱۔جنوری۔ ۱۹۸۲ کراچی

Click here for Audio

عزیزانِ من! یا علی مدد۔

حضرت آدم علیہ السّلام کا قصّہ جو قرآن میں ہے، انتہائی اہم قصّہ ہے اور اِس کی اہمیت کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو جیسا کہ ظاہر ہے کہ وہ اوّلین انبیاء ہیں، اوّلین رُسُل ہیں یعنی سب سے پہلے پیغمبر ہیں اور پھر ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو انسانیّت بھی وہیں سے شروع ہوجاتی ہے اور اِس کے علاوہ یہ ہے کہ دَور اور زمانہ گول گول سا ہے لیکن خداوندِ عالم نے آدمؑ سے متعلق یا کہ زمانۂ آدم سے متعلّق جو تعلیمات ہیں یا جو اسرار ہیں یعنی بھید، اُن کو دو طرح سے پیش کیا ہے۔ ایک یہ کہ جو خواص یعنی خاصانِ الٰہی ہیں وہ اُس کو سمجھیں کہ آدمؑ سے پہلے بھی کئی کئی زمانے اور کئی کئی اَدوار گزر چکے ہیں اور دوسرا مقصد اِس میں یہ ہے کہ عوام جن کی عقل محدود ہے وہ یوں سمجھیں جیسا کہ انسانیّت بھی، دین بھی اور زمانہ بھی آدمؑ ہی سے شروع ہو رہا ہو۔ اِس کے یہ دو مقصد ہیں اور جیسا کہ آپ نے سُن لیا، ہماری بیٹی شاہدہ نے بہت اچھی طرح سے اور مکمّل اعتماد کے ساتھ قصّۂ آدم سے متعلّق نکات کو آپ کے سامنے پیش کیا اور ہر نکتے کی شاندار طریقے سے وضاحت کی۔ آپ کے لئے، ہمارے لئے قصّۂ آدم بے حد ضروری ہے مگر تاویل کی روشنی میں، حکمت کے طور پر اُس کو سمجھ لینا چاہئے۔ چنانچہ زمانۂ آدم یا قصّۂ آدم کچھ اِس طرح سے ہے کہ ایک گول (circle) ہے اور وہ مکمّل گول ہے مگر کچھ لوگ اِس کو گول نہیں سمجھتے ہیں بلکہ اُس کے دونوں سرے آپس میں چھوتے نہیں ہیں، وہ یوں خیال کرتے ہیں اِن دونوں سروں کے درمیان کٹاؤ سمجھتے ہیں ایسا نہیں۔ اگر کوئی ہوشمند قصّۂ آدم کو حکمت کی روشنی میں سمجھے تو اُس کو علمی طور پر یوں فائدہ ہوگا کہ ماضی کے طور پر مستقبل کو بھی سمجھے گا، قصّہ ہوگا تو ماضی کا مگر اُس ماضی کے اندر مستقبل کا بھی تذکرہ ملے گا۔ کہنا یوں ہے کہ خدا کی بادشاہی کبھی ختم نہیں ہوسکتی ہے اِس لئے اِس دَور کے آدم کا زمانہ ختم ہوجائے گا تو دوسرے آدم کا دَور شروع ہوجائے گا اور پھر آپ نے ماضی کے آدم سے متعلّق جو حقیقتیں سمجھ رکھی تھیں وہی حقیقتیں آنے والے آدم سے بھی متعلّق ہوجائیں گی۔ آج یہ بات پوشیدہ نہیں ہے، چھپی ہوئی نہیں ہے، فرض کریں کہ چاند پر یا کسی اور سیّارے پر ایک نئی آبادی کا آغاز ہوجائے اور وہاں پر جو بھی ہستی ابوالائمّہ اور ابوالانبیاء کی حیثیّت سے ہوگی یعنی جو سب سے پہلا پیغمبر ہوگا اور جو سب سے پہلا امام ہوگا وہی تو اُس سیّارے کا آدم ہوگا۔ اب ایسے میں آپ نے جو کچھ قرآن میں ماضی کے آدم کے متعلّق سُن لیا تھا یا پڑھ لیا تھا اور اُس کی گہرائیوں تک آپ پہنچے تھے تو وہی حقیقتیں، آپ کے لئے کام آئیں گی۔

اِس کے علاوہ جس طرح اِنہوں نے فرمایا کہ آدم تو کئی درجات میں ہوتے ہیں اور سب سے بڑے آدم تو عقلِ کُلّی ہیں اور پھر دَور کے آدم ہیں اور اِس دَور کو جیسا کہ آپ میں سے بہت سے حضرات نے انگریزی لٹریچر پڑھا ہو گا، (cycle) کہتے ہیں، تو ہر (cycle) کے آغاز میں جو بہت بڑی ہستی ہوتی ہے وہ اُس (cycle) کے آدم کی حیثیّت سے ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ ہر زمانے میں جو امام ہیں وہ اپنی مدّت یا اپنے (period) کے آدم ہیں اور اِنہوں نے ٹھیک طرح سے وضاحت کی کہ خدا نے جہاں فرمایا ہے کہ: اُس نے اپنی رُوح آدم میں پھونکی (۲۹:۱۵)۔ یہ بات اِس طرح سے نہیں ہے جس طرح عوام سمجھتے ہیں، یہ تاویلی بات ہے اور حکمت کی روشنی میں اِس کو سمجھ لیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ ایک دفعہ کا واقعہ نہیں ہے، یہ ایک تسلسل ہے، یہ ایک سلسلہ وار بات ہے اور آپ کو یہ یاد ہو کہ خدا پیغمبر اور امام کے فعل کو (adopt) کرتا ہے، اپناتا ہے۔ کوئی بات، کوئی کام پیغمبر کرتا ہے اور امام کرتا ہے لیکن خدا اُس فعل کو، اُس قول کو اپنی ذات سے منسوب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہا اُس نے کہا اور اُس نے کیا، ایک یہ بھی ہے اور یہ بہت ہی بنیادی (principle) ہے اسلام کے اندر اور آپ کو اِس قسم کی آیتیں قرآن میں بہت ملیں گی کہ جن سے یہ مفہوم ملے گا کہ کسی پیغمبر نے کوئی کام کیا تو خدا نے فرمایا کہ یہ تو میں نے کیا ہے۔ یہاں تک کہ صوفیوں میں بھی یہ حقیقت مسلّمہ ہے اور چنانچہ مولائے رُوم کہتے ہیں کہ:

گرچہ قرآن از لبِ پیغمبر است ہر کہ گوید حق نہ گفت آن کافر است

گو کہ قرآن رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زبانِ مبارک سے صادر ہوا ہے یعنی آنحضرتؐ ہی نے اِس کو قرآن کو پیش کیا ہے اور آنحضرتؐ نے بولا ہے، آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے ہے۔ اِس کے باوجود اگر کوئی کہتا ہو کہ خدا نے نہیں کہا ہے تو وہ کافر ہے۔ اِسی طرح انسانِ کامل یعنی پیغمبر اور امام کے قول و فعل کو خدا اپنی ذات سے منسوب کرتا ہے۔ اِس اُصول کے تحت خدا کا آدم میں اپنی رُوح پھونکنا یوں ہے کہ زمانے میں پیغمبر اپنے جانشین میں اپنے نور کو جس اُصول کے مطابق منتقل کرنا چاہئے اُس اصول کے مطابق منتقل کرتے ہیں اور اِسی طرح ہر امام اپنے جانشین میں اپنے نور کو تبدیل کرتے ہیں اور اِسی طرح خدا کا خلیفۂ زمان میں رُوح پھونکنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کے اندر ایک یہ اُصول بھی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: اُس کی عادت جو کچھ ہے وہ ہو کے گزری ہے اور اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آنے کی (۴۳:۳۵)۔ اِس اُصول کی روشنی میں اگر خدا کا رُوح پھونکنا، خدا کی رُوح زمانے کے پیغمبر اور امام میں وہ دو طرح سے ہوتا، ایک یہ کہ خدا نے ذاتی طور پر آدم میں اپنی رُوح پھونک دی اور ایک یہ کہ بعد میں آدم سے لے کر آنحضرتؐ تک بات کریں گے کہ یہ نور سابق سے لاحق میں یعنی اگلے پیغمبر سے پچھلے پیغمبر میں یا پچھلے امام میں منتقل ہوتا رہا تو یہ دو باتیں ہو گئیں۔ دو قانون ہو گئے، ایک تو خدا نے اُس طرح اپنی رُوح پھونکی جس طرح کہ اہلِ ظاہر

اور عوام سمجھتے ہیں۔ایک تو یہ کہ نسل بہ نسل نور منتقل ہوتا رہا تو پھر اِس صورت میں دو خدا کی عادتیں ہوگئیں، دو سنّتیں ہوگئیں حالانکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ میری ایک ہی سنّت ہے، ایک ہی عادت ہے یا کہ میرا ایک ہی قانون ہے، اُس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئے گی، تو اِس تجزیے سے، اِس تحقیق سے یہ پتا چلا کہ خدا کی عادت اور اُس کی سنّت ایک ہی ہے اور وہ یہی ہے کہ زمانے میں اگر پیغمبر ہے تو پیغمبر اور اگر امام ہے تو امام، اپنے جانشین میں نور کو جس طرح منتقل کرنا چاہے منتقل کرتے ہیں، تو یہ ہوا اللہ کا اپنی رُوح خلیفہ کی ذات میں، اُس کی ہستی میں پھونک دینا، تو پھر اِنہوں نے ایک بہت اچھی بات یہ بھی کہی کہ ایک چھوٹا خلیفہ بھی ہے، ''خلیفۂ اصغر''۔ وہ کون ہے؟ آپ میں سے ہر ایک ہوسکتا ہے یعنی انسان ایک دُنیا ہے، اِس کو عالمِ صغیر کہا جاتا ہے، انسان اپنے آپ میں، اپنی ہستی میں، اپنے وُجود میں ایک دُنیا ہے، ایک پوری دُنیا ہے۔اُس کے اندر وہ سب کچھ ہے جو کچھ کہ دُنیا میں، اِس دُنیائے ظاہر میں ہے، اِس پوری کائنات میں ہے، ذرّات کی شکل میں ہے یا صلاحیتوں کی شکل میں ہے، رُوحوں کی شکل میں ہے تو ایک پوری کائنات انسان کے اندر سموئی ہوئی ہے۔جب انسان ریاضت وعبادت سے اپنی ہستی پر فتح پاتا ہے، اپنی ذات کو (conquer) کرتا ہے تو اُس وقت کوئی مومن، کوئی مردِ درویش، کوئی صوفی، کوئی خوش نصیب انسان اپنی ذات کے اندر خلیفہ اور آدم قرار پاتا ہے۔اُس وقت اُس انسان کے اندر جتنے ملائکہ ہیں، جتنے فرشتے ہیں سب اُس کے لئے سجدۂ تابعداری بجالاتے ہیں مگر کچھ مخالف طاقتیں ہوتی ہیں جو کہ اِس سجدۂ اطاعت یا کہ سجدۂ فرمانبرداری سے سرکشی کرتی ہیں اور وہ سب کچھ سامنے آتا ہے جو آدم پر گزرا تھا، تو مطلب یہ ہوا کہ جس چیز کا نام معرفت ہے وہ عملی طور پر سامنے آتی ہے بلکہ یہاں تک کہنا چاہئے کہ جتنے قصّے قرآن میں ہیں پیغمبروں کی ذات سے متعلّق وہ سب واقعات اور وہ سب سرگذشتیں مومن پر گزرتی ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنی معرفت کے کورس کو مکمّل کرلیتا ہے۔

بہت سے صوفیوں نے معرفت کا نام تو سُن لیا لیکن اُن کو یہ نہیں معلوم کہ معرفت حاصل ہوتی ہے کس طرح؟ اور ہم نے معرفت جس طرح حاصل ہوتی ہے اُس کی طرف ایک واضح اشارہ کردیا کہ معرفت ایک عملی چیز ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر کامیاب مومن عملاً پیغمبر ہے، پیغمبر نہیں ہے بلکہ پیغمبر کے نقشِ قدم پر چلنے والا ہے۔پیغمبر کے جتنے ٹائٹلز ہیں یعنی جتنے پیغمبر کے نام آئے ہیں اُن میں سے ایک ایک کرکے آپ دیکھیں تو یہی بات آپ کے سامنے آئی مثلاً پیغمبر کے ٹائٹلز میں سے ایک ٹائٹل ہے ہادی جو بہت ہی آسان لفظ ہے۔آپ اِس کو سمجھ سکتے ہیں، ہادی معنی؟ کبھی آپ انگریزی میں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں (guide)، فارسی میں رہنما، رہبر، پیشوا، راستہ بتلانے والا اور راستہ کون سا؟ صراطِ مستقیم۔ اِس صراطِ مستقیم پر آگے آگے چلنے والا، کس کے آگے آگے چلنے والا؟ اُن تمام کے آگے آگے چلنے والا جو خدا و رسول کو مانتے ہیں، امام کو مانتے ہیں خواہ یہ ہدایت پیغمبر ذاتی طور پر کرے یا اپنے نمائندے کے وسیلے سے کرے، کہ نمائندہ یا کہ جانشین آنحضرتؐ سے الگ نہیں ہے، تو اِس کا کیا خلاصہ مل گیا؟ یہی ہوا کہ جن رُوحانی اسٹیج سے آنحضرتؐ

گزرتے گئے ہیں اور معراجِ یقین تک پہنچ گئے ہیں اُن تک جانا ہوگا اور لازمی طور پر جانا ہوگا ورنہ معرفت کیسی؟ خداشناسی کہاں؟ رُوحانیت کدھر؟ کیا ایسے میں کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ساتھ ساتھ اِسی کے وہ نبوّت کا بھی اور رسالت کا بھی دعویٰ کرے یا کہے کہ میں امام ہوں، میں پیغمبر ہوں؟ نعوذ باللہ منھا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ رسولؐ کا اقتدا کرتا ہے یعنی رسولؐ کے پیچھے پیچھے چلتا ہے، امامؑ کی پیروی کرتا ہے، معرفت کے راستے پر، حقیقت کے راستے پر چلتا ہے اور خداشناسی تک پہنچ جاتا ہے، معراجِ یقین تک پہنچ جاتا ہے، تو کیا ایسے شخص کو دعویٰ کرنا چاہئے کہ وہ پیغمبر ہے؟ نہیں! پیغمبر کا پیرو ہے اور مُرید ہے، امام کا پیرو ہے، اُس کا مُرید ہے۔

میرا اِس بات پر، اِس نکتے پر زور دینا اِس لئے ہے کہ لوگ معرفت کی اصطلاح کو تو مانتے ہیں، خداشناسی کے لفظ کو بھی (use) کرتے ہیں، نجات کو بھی مانتے ہیں، خدا تک پہنچنا اُس کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن رستے میں جو کچھ ہے اُس کو نہیں سمجھتے ہیں، اُس کو نہیں مانتے ہیں، اِس کی کیا وجہ ہے؟ اِس کی وجہ البتہ یہ ہے کہ وہ لوگ اِن بھیدوں کے سمجھنے کے اہل نہیں ہیں، وہ اِس نعمت کے حقدار نہیں ہیں اور اُن میں یہ جرأت نہیں ہے کہ اِس کو سمجھیں اور اِس کی وضاحت کریں۔ بہرحال سب سے آخری درجہ تو یہ ہے جو آپ حضرات سب جانتے ہیں خدا سے واصل ہو جانا، یہ تو ہر مسلمان مانتا ہے، ہر مومن اِس کو قبول کرتا ہے۔ جب یہ حقیقت ہے تو پھر اُس سے پہلے یہ حقیقت ہے کہ احوالِ انبیاء جو ہیں رُوحانی طور پر سامنے آتے ہیں تاکہ ہم پیغمبروں کو پہچان سکیں اور جب تک کوئی شخص پیغمبر کے پیچھے پیچھے نہیں چلتا اور رُوحانیت کی منزلوں کو نہیں دیکھتا، اُن کا مشاہدہ نہیں کرتا تو پیغمبر کی شناخت اُسے حاصل نہیں ہو سکتی ہے اور یہ بات الگ ہے کہ زبانی اقرار وہ کر سکتا ہے، تو جس قدر بھی کوئی شخص مشاہدے میں اور معرفت میں آگے جائے، اُس قدر وہ پیغمبر اور امامؑ کی عظمت کو، اُن کی بزرگی کو، اُن کی شان کو سمجھ سکتا ہے، تو آدمؑ سے متعلّق جو قصّہ ہے وہ بڑا اہم قصّہ ہے، اِس پر کبھی (discuss) بھی ہونا چاہئے۔ اِس قصّے کو سمجھنا چاہئے اور اِن شاء اللہ کبھی قصّۂ آدمؑ سے متعلّق سوال و جواب کی صورت میں یا مذاکرے کی شکل میں ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ اِس پہ بات چیت کرنے کے لئے کوشش کریں گے تو اور اِس پر آگے بھی کافی کام ہوا ہے تو ہمارے عزیزان جن کو شوق ہو قصّۂ آدم سے متعلّق (discuss) کرنے کے لئے، وہ آپس میں کر سکتے ہیں اور مشترکہ طور پر بھی یہ بحث ہو سکتی ہے اور ہمارے عزیزوں نے جو کلاس کا پروگرام بنایا ہے میرا خیال ہے کہ اِس میں ایک مضمون یہ بھی ہو، تاکہ اگر اُس میں کوئی نکتہ غور طلب ہو یا کسی نکتے پر کوئی سوال پیدا ہو جائے تو اِن شاء اللہ مولا کی یاری سے ہم بھی اِس میں حصّہ لیں گے اور یہاں پر ہم ایک وقفہ کر کے دیکھتے ہیں کہ یہ جو مجلس ہے اِس کا پروگرام کیسا چلتا ہے۔

اِس میں یہ ہے کہ مومنین کے باہم مل کر عبادت کرنے سے اِن کی رُوحانی صلاحیت کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے اور فرشتے رُوحانیین مدد کرتے ہیں اور خداوندِ عالم کی رحمت شامل حال ہو جاتی ہے اِس مل کر کرنے والی عبادت سے، کہ

تنہائی میں عبادت اتنی طاقتور نہیں ہوتی ہے جتنی کہ اجتماعی عبادت طاقتور ہوتی ہے۔ اگر اُصول کے مطابق مشق کی جائے اور اُصول کے مطابق عبادت کی جائے تو اِس میں بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ اب ہم کچھ علم کی باتیں کرنے کے لئے کوشش کریں گے، اِس کے لئے آپ میں سے کسی کا کوئی اِس سلسلے میں کوئی سوال ہو، آج کے موضوع سے متعلّق یا کوئی مفید سی بات جس سے کہ سب کو فائدہ ہو تو اِس قسم کے سوالات کو بھی دیکھتے ہیں اور اگر سوالات نہیں ہیں تو کچھ دوسری گفتگو ہونی چاہئے، وہ یہ کہ یہ کیوں ایسا ہے کہ عبادت اتنی ضروری ہے؟ بندگی یا یہ کہ عبادت اِس قدر دشوار اور مشکل کیوں ہے؟ وہ آسان کیوں نہیں ہے؟ وہ سہل کیوں نہیں ہے؟ وہ عبادت مومنین کی عبادت، فرشتوں کی عبادت کی طرح مسلسل کیوں نہیں ہو جاتی ہے؟ (automatic) کیوں نہیں ہو جاتی ہے؟ ایسے سوالات۔ مومنین کی عبادت فرشتوں کی عبادت کی طرح (automatic) ہو سکتی ہے لیکن اِس مقام پر نہیں، کچھ آگے چل کر۔ دین کی تشبیہہ رستے سے دی گئی ہے اور دین کو صراطِ مستقیم کہا گیا ہے، اِس کا مطلب یوں ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مسافر راستے پر آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے اُس کو آسانیاں ہو جاتیں ہیں مگر دُنیا کے کسی رستے میں شاید یہ بات نہ ہو، آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آسانیاں نہ ہوں لیکن دین کے اِس رستے پر ضرور آگے سے آگے آسانیاں ہو جاتیں ہیں۔ قرآنِ مقدّس میں سے آپ ایک اور مضمون کو لیں، وہ دین میں آسانی سے متعلّق موضوع کو لیں کیونکہ دوسری اہم آیات کے ساتھ ساتھ یہ موضوع بھی ضروری ہے کہ قرآن میں آگے چل کر آسانی سے زیادہ آسانی ہونے کا تصوّر دیا گیا ہے اور خدا نے فرمایا ہے کہ: ''فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ○ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا'' (۹۴:۶۔۵) بے شک دشواری کے ساتھ ساتھ آسانی بھی ہے، مشکل کے ساتھ ساتھ آسانیاں بھی ہیں۔ یعنی جس قدر مشکلات پر قابو پایا جاتا ہے اُس قدر دین میں آسانیاں ہو جاتی ہیں۔ اِس بات کا اطلاق دَور پر بھی ہوتا ہے اور فرد پر بھی ہوتا ہے یعنی پوری قوم پر بھی اِس کا اطلاق ہوتا ہے اور فرد پر بھی اِس کا اطلاق ہوتا ہے۔ پوری قوم پر اِس کا اطلاق یوں ہے کہ زمانۂ رسولؐ میں جو سختیاں تھیں وہ بعد میں نہ رہیں اور اب اِس کے مقابلے میں بہت آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ زمانۂ رسولؐ میں سختیاں اِس طرح سے تھیں کہ اُس میں جہاد تھا، غریبی تھی، مفلسی تھی، ہنر نہیں تھا، علم نہیں تھا، رُوحانیت بہت بلندی پر تھی، امام کی شناخت نہیں تھی، اسلام کا ظاہری پہلو نمایاں تھا اور باطن کا ابھی ابھی شروع ہوا تھا۔ اِس لئے اُس زمانے میں کافی دشواریاں تھیں لیکن جس طرح خدا نے وعدہ فرمایا تھا کہ آگے چل کر آسانیاں ہوں گی اور اِس کے متعلّق کئی قرآن میں آیات ہیں تو پھر آسانی شروع ہو گئی، دشواریاں کم سے کم تر ہوتی چلی گئیں اور اِس کی ایک رفتار رہی یعنی آگے سے آگے آسانیاں اور آگے سے آگے آسانیاں۔ میں اُس دین کی بات کرتا ہوں جو اسلام میں مرکزی حیثیّت رکھتا ہے اور جن لوگوں نے اپنے لئے دشواریاں ہی دشواریاں پیدا کیں ہیں، میں اُن کی میں بات نہیں کرتا ہوں۔ جو اسلام میں حقیقتِ حال ہے اُس کی میں بات کرتا ہوں اور اسمٰعیلی مذہب کی بات کرتا ہوں، تو آسانیاں ہوتیں چلیں گئیں یہاں تک کہ اِس زمانے میں بہت

آسانیاں ہیں، یہ بات ہوئی پوری قوم کی۔ اب اِسی طرح ایک فرد کی بھی یہی بات بنتی ہے مثلاً ایک مومن ہے، تو شروع شروع میں اِس کو سختیاں برداشت کرنی ہوں گیں اور وہ سختیاں برداشت کرے گا تو سختیاں جو ہیں کم سے کم ہوتی چلیں جائیں گی، پھر آسانیاں شروع ہو جائیں گی اُس کی عبادت میں، اُس کے اُٹھنے میں، اُس کے بیٹھنے میں اور اُس کے ذکر کے مسلسل ہو جانے میں اور علم کے اضافے سے اور حقیقت کو سمجھنے سے ہر طرف سے آسانی ہی آسانی ہوتی چلی جائے گی۔ میں ایسے مومنین کی بات کرتا ہوں جو باقاعدہ ہیں جو دین سے صحیح معنوں میں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ میں کسی سُست اور کاہل شخص کی بات نہیں کرتا ہوں، جو اُصول کے مطابق کام نہیں کرتا ہے، جو خود سُست ہے، جرأت نہیں کرتا ہے، جو دُنیا کو چاہتا ہے، اُس پر یہ بات پوری نہیں اُترے گی، وہ اِس کسوٹی کے مطابق پورا نہیں ہوگا۔

جس طرح آگے کچھ فرقوں سے متعلّق میں نے بات کی تھی اور اُس میں ایک مذہب کو (particular) لیا تھا اِسی طرح انفرادی طور پر بھی یہ بات اُن پر صادق آتی ہے جو صحیح جدو جہد کرتے ہیں، کوشش کرتے ہیں۔ پھر آگے چل کر یہ مومنین فرشتوں سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ ایک دن جسم میں ہوتے ہوئے فرشتے بن جائیں گے۔ آپ ہم سے پوچھیں کہ کوئی شخص کس طرح جسم میں ہوتے ہوئے فرشتہ بن سکتا ہے؟ تھوڑی دیر کے لئے یا کچھ سالوں کے لئے یا ہمیشہ کے لئے فرشتہ ہو جانا ممکن بات ہے۔ اِس کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ فرشتہ کی خصوصیات کیا ہیں؟ فرشتہ کی خصوصیات میں سے ایک دو کا میں ذکر کروں گا۔ ایک یہ کہ فرشتے کا ذکر مسلسل رہتا ہے، یہ یاد رکھنا یعنی فرشتے کا جو ذکر ہے، فرشتہ جو نامِ خدا کو جانپتا ہے وہ (continue) ہو جاتا ہے ہمیشہ ہمیشہ ہمیشہ، ایک بات۔ ایک یہ کہ وہ ذکر سے تھکتا نہیں ہے، یہ دوسری بات۔ ایک یہ کہ وہ حکمِ خداوندی کو ہمیشہ بجالاتا ہے اور نافرمانی نہیں کرتا ہے، تین باتیں۔ ہیں تو تین اور بہت تھوڑی باتیں ہیں مگر اِن باتوں کے اندر اتنا وزن ہے اور اتنے معنی ہیں کہ تمام خوبیاں سمٹ سمٹ کر اِن تین باتوں میں آجاتی ہیں یعنی جو میں نے کہا کہ فرشتہ ہمیشہ ذکر کرتا ہے اور یہ کہا کہ وہ ذکر سے تھکتا نہیں ہے اور یہ کہا کہ فرشتہ ہمیشہ فرمانبرداری کرتا ہے۔ اِن تین چیزوں کو جو بھی اپنائے گا، جو بھی لے گا تو وہ دُنیا میں زندہ رہتے ہوئے فرشتہ بن جائے گا یعنی وہ ہمیشہ ذکر کو جاری رکھے اور اُس سے سستی اور غفلت نہ کرے اور ساتھ ہی ساتھ فرمانبرادری کے لئے کوشان رہے، تو فرمانبرداری میں ساری باتیں آجاتی ہیں، فرمانبرداری سے کوئی بات باہر نہیں رہتی ہے، کوئی فریضہ فرمانبرداری سے باہر نہیں رہ سکتا، کوئی قول، کوئی عمل جسے دین میں ضرورت ہے باہر نہیں رہتا ہے، فرمانبرداری میں ساری باتیں آجاتی ہیں اور پھر یہ تین چیزیں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ ذکر جو ہے وہ فرمانبرداری کے لئے مدد کرتا ہے، فرمانبرداری جو ہے وہ ذکر کے لئے مدد کرتی ہے اور نہ تھکنا یعنی مسلسل ذکر کرنا جو ہے وہ دونوں کو اور اپنے آپ کو مدد کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ذکر آگے ہے اور فرمانبرداری بعد میں، ایسا نہیں کہ فرمانبرداری آگے ہے اور ذکر بعد میں ایک

ساتھ ہے۔ کچھ زیادہ ذکر کیا جائے تو کچھ زیادہ فرمانبرداری ہوگی اور کچھ زیادہ فرمانبرداری کی جائے تو کچھ زیادہ ذکر ہو جائے گا یعنی نامِ خدا جاری رہے گا، تو جتنی دیر تک مومن عبادت میں بیٹھتا ہے اور ذکر کرتا ہے اتنی دیر کے لئے وہ فرشتہ ہے اور جتنے عرصے کے لئے وہ نافرمانی نہیں کرتا ہے تو اُتنے عرصے کے لئے وہ جزوی طور پر، (partially) فرشتہ ہے اور اگر اِس کو مستقلاً فرشتہ بن جانا ہے تو پھر دائم الذّکر ہو جائے، ہمیشہ نامِ مولا کو جانپے آہا! کتنا مزہ آتا ہے، کوئی مومن ہو جس کے ہاتھ میں تسبیح ہو اور وہ مومن شرافت والا ہو، سنجیدہ ہو، ایمانی ہو، علم کو چاہنے والا ہو، معرفت کو چاہنے والا ہو اور مومنین کے متعلّق اُس کے دل میں نیک خیالات ہوں، ایسے مومن کو کوئی بھی دوسرا دیکھے گا مومن تو اُس کے دل میں خوشی آئے گی، وہ خوش ہو جائے گا، اُس کی رُوح تازہ ہو جائے گی، اُس کا ایمان تازہ ہو جائے گا،

فرشتے کی بات تھی اور فرشتے کی بات یہ کہ مومنین فرشتے بن سکتے ہیں، مسلسل ذکر کریں اور فرشتے کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ علم کو چاہتا ہے، اِن خوبیوں کے آپس میں رشتہ ہے۔ جس طرح دُنیا کے اندر ایک بُرائی دوسری بُرائی کو جنم دیتی ہے، اِس طرح ایک نیکی دوسری نیکی کو جنم دیتی ہے، اُس کو قوّت بخشتی ہے، تو علم ایک نور ہے، وہ ہدایت ہے، کس کا نور ہے بھائی؟! امام کا نور ہے، خدا کا نور ہے، رسولؐ کا نور ہے، قرآن کا نور ہے علم۔ جس کو علم سے عشق ہوگا یہ لازمی بات ہے کہ اُس کو بُری چیزوں سے عشق نہیں ہوگا، وہ بُری چیزوں کو نہیں چاہے گا۔ جو مومنین کو چاہے گا وہ غیروں کو نہیں چاہے گا، جس کی عادت سردی کی ہو تو وہ گرمی کو کیسے چاہے گا اور جس کی عادت گرمی کی ہو اُس سے سردی کیسے برداشت ہو سکتی ہے؟ تو اُس کی طبیعت کے اندر ایک عادت پیدا ہوگئی اور وہ مضبوط بھی ہوگئی تو پھر جو مومنین کو چاہتا ہے وہ منافقین کو اور غیروں کو، دوسروں کو نہیں چاہتا ہے۔ جو امام کو چاہتا ہے تو امام کے رُوحانی فرزندوں کو، امام کے رُوحانی اولاد کو چاہتا ہے، امام کے دوستوں کو چاہتا ہے، تو یہ ہے کہ ایک خوبی دوسری ایک خوبی کے لئے وسیلہ بن جاتی ہے اور جس کے پاس ایک دولت ہوتی ہے تو دوسری دولت کا پیدا کرنا آسان بات ہے اور جس کے پاس ایک ہنر ہے اُس کی بنیاد پر دوسرے ہنر کو بھی حاصل کر سکتا ہے، میں نے کہا کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو جنم دیتی ہے، ایک خوبی دوسری خوبی کو جنم دیتی ہے۔

ابلیس کی مثال لیجئے کہ سب سے پہلے اور شروع میں اُس نے صرف ایک گناہ کیا تھا، پھر اُس گناہ نے دوسرے گناہ کو جنم دیا، دوسرے نے تیسرے کو اور تیسرے نے چوتھے کو۔ اِس طرح اُس کے گناہ اتنے زیادہ ہو گئے کہ وہ ناقابلِ معافی ہو گئے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کون سا گناہ ہے جو ناقابلِ معافی ہے قرآن میں؟ آپ کہیں گے شرک، ہاں! شرک۔ خدا کے ہوتے ہوئے دوسرے کسی کو چھوٹا خدا، برابر کا خدا ماننا، یہ شرک ہے، ایسی حالت میں خدا معاف نہیں کرتا ہے۔ اب آپ سوال کریں کہ اگر بات یہ ہے اور قرآن کی بات ہے تو پھر ابلیس نے کون سا شرک کیا تھا؟ بلکہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اُس نے شرک سے بھاگنے، گریز کرنے کا ایک طریقہ سوچا تھا وہ یہ کہ اُس نے کہا کہ خداوند! تُو

نے مجھ کو روشنی سے، آگ سے پیدا کیا ہے اور اِس کو حقیر مٹّی سے پیدا کیا ہے تو روشنی ظلمت کے سامنے کس طرح سجدے میں سرنگون ہو جائے؟ یہ بات کی تھی نا! میں آپ کو ایک بہت بنیادی راز کی بات بتاؤں۔ آپ باور کریں گے یہ کہ اصل میں جس شرک کا قرآن میں ذکر ہے وہ امامِ حق کی بجائے کسی اور کو امام قرار دینا اِس (sense) میں ہے، اور جہاں شریعتی طور پر خدا کا تصوّر ہے اُس میں شرک کا کوئی سوال نہیں ہے، اور نہ دُنیا میں کوئی ایسا شخص ہے جو خدا کو خدا تسلیم کرتے ہوئے کسی اور کو بھی چھوٹا یا برابر کا خدا مانتا ہو، ایسا کوئی نہیں ہے، نہ کوئی ایسا مذہب ہے اور نہ کوئی ایسا فرد ہے۔ شرک واقع کہاں سے ہوتا ہے؟ شرک واقع ہوتا ہے امام کو امام تسلیم نہ کرنے سے اور امام کی جگہ پر کسی اور کو پیشوا ماننے سے، رہنما ماننے سے، ہادی ماننے سے۔ اب اِس واقعہ کو، اِس تاویل کو واقعۂ شیطان سے ملایئے تو شیطان کے لئے بھی یہی بات ہوئی تھی۔ اُس نے براہِ راست خدا سے انکار تھوڑی کیا تھا! اُس نے تو جو زمانے میں ہادیٔ برحق تھا، جو خدا کا نمائندہ تھا، جو خدا کا جانشین تھا، جو خلیفۂ خدا تھا اُس کے وسیلے سے شرک کیا تھا اور اندر اندر سے دیکھا جائے تو یہ شرک کیا تھا۔

اگر یہ بات نہ ہوتی یہ شرک کے علاوہ کوئی اور گناہ ہوتا، کوئی اور نافرمانی ہوتی تو خدا جہاں قرآن کے اندر جو دین کا قانون ہے، ایک ایسے گناہ کا ذکر فرماتا ہے جس کے لئے کوئی معافی نہیں ہے تو اُسی کے (side) میں الگ ایک (section) کے طور پر خدا ابلیس کا ذکر بھی اِس صورت میں فرماتے کہ دیکھو ایک تو شرک ہے اور ایک شیطان کا وہ گناہ تھا جس کے لئے میں نے معاف نہیں کیا تھا، تو پھر خدا کیوں بھول گئے کہ اُس نے ایک ہی ایسے گناہ کا ذکر کیا جس کے لئے معافی نہیں ہے اور پھر اِسی کے ساتھ ساتھ اگر اِس شرک میں شیطان شامل نہیں ہے، شیطان کا گناہ کچھ اور طرح سے ہے تو پھر خدا کو چاہئے کہ شرک جیسے عظیم گناہ کا جہاں ذکر فرماتا ہے اُسی کے (side) میں ابلیس کے گناہ کا بھی کچھ بیان کرتا۔ ایسا نہیں ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اِسی شرک میں ابلیس کا ذکر بھی ہے اور ابلیس نے شرک کیا تھا اور اگر ابلیس نے شرک نہ کیا ہوتا تو خدا ضرور اُس کو معاف کرتا اور شرک یہ ہے کہ زمانے میں خدا کی طرف سے اگر پیغمبر ہے تو پیغمبر کی شناخت، اُس کی تابعداری لازمی ہے اور اگر امام ہے زمانے میں تو امام کی شناخت اور اُس کی فرمانبرداری لازمی ہے، اُس کے لئے سر جھکانا ہے، تو آدم چونکہ امام بھی تھے، پیغمبر بھی تھے، دونوں مرتبے اُس میں جمع تھے، اُس نے بشریت کو دیکھا۔ دیکھئے ابلیس کی عقل کو دیکھیں، وہ سوچتا نہیں ہے کہ خدا نے حکم کیا ہے کہ سجدہ کرو، وہ یہ بھی سوچتا نہیں ہے کہ خدا نے اُس کو خلیفہ بنایا۔ اِس نے نہیں سوچا ہے کہ اِس مرتبے کی کیا اہمیت ہے، اور یہ کتنی عظیم مرتبت ہے۔ گیا وہ یعنی بشریت پر، ظاہر پر اور جسم پر گیا، بات جسم میں اُس نے کی، یہ نہیں کہا کہ یہ آپ کا خلیفہ ہے، آپ کا نمائندہ ہے، تو ابلیس کی جو عقل تھی وہ کھوٹی ہوگئی اور اُس نے کام نہیں کیا تو شرک ہوگیا۔ پھر بات وہی ہوگئی کہ ایک گناہ کیا جو سب سے بڑا گناہ تھا۔ پھر اِس گناہ نے دوسرے گناہ کو جنم دیا، پھر تیسرے گناہ کو جنم دیا، یہاں تک کہ ابلیس نے جو ایک گناہ کیا تھا وہ اتنا پھیل گیا کہ اُس کو پوری

طرح سے گناہ نے ڈبو دیا۔ پھر اُس سے بچ گیا اور دُنیا میں ابلیس کے گناہ پھیل گئے اور بہت سے لوگوں کو بھی ابلیس کے اِس کرتوت نے، ابلیس کے اِس گناہ نے ڈبو دیا۔ یہ ہے اسمٰعیلی تصوّر اور تاویل کہ ہمارے بزرگوں نے اِس کو اِس طرح سے بیان کیا ہے اور قرآن کے اندر یہ (chapter) بھی بہت وسیع ہے کہ شیطان کو پہچاننا چاہئے، اِس لئے نہیں کہ اُس سے ہم کو کوئی فائدہ ملے گا بلکہ اِس لئے کہ جب ہم اُس کو پہچانیں گے تو اُس سے بچ سکیں گے۔

بزرگانِ دین نے یہ فرمایا ہے کہ دُنیا کے اندر جس کو زہر سے بچنا ہے تو اُس کو چاہئے کہ وہ زہر کی شناخت کر لے یعنی جس کو زہر سے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہے تو اُس کو احتیاط کے طور پر چاہئے کہ زہر کی شناخت کرے اور وہ احتیاط رکھے، اِس طرح ابلیس سے بچنے کے لئے ابلیس کی شناخت ضروری ہوتی ہے۔ جس طرح عام محاورے میں کہا جاتا ہے کہ ہوشمند انسان وہ ہے جو دوست اور دشمن دونوں کی الگ الگ شناخت کر لیتا ہے، دوست کی شناخت دوست کے طور پر ہونی چاہئے اور دشمن کی شناخت دشمن کے طور پر ہونی چاہئے۔ ایسا نہ ہو اور یہ شناخت نہ ہو تو کیا ہوگا؟ ہوسکتا ہے کہ ہم دشمن کو دوست سمجھیں اور دوست کو دشمن قرار دیں تو دونوں طرف سے ہم خسارے میں ہوں گے، ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ہماری شناخت، ہماری بصیرت اِس طرح سے کام کرے کہ ہم دوست اور دشمن دونوں کو پہچانیں اور پھر دونوں کے درمیان فرق و امتیاز رکھیں۔ اِس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ ہم کو شیطان کی شناخت ہونی چاہئے، تو شیطان دو مقام پر ہوتا ہے یا کہ شیطان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے شیاطین، شیاطینِ جنّی کہلاتے ہیں یعنی آنکھوں سے اوجھل ہیں، ہم اُن کو نہیں دیکھ سکتے ہیں، دوسرے شیاطین کا نام قرآن میں شیاطینِ اِنسی ہے، وہ انسانوں میں چلتے پھرتے ہیں، تو آپ پھر یہ سوال کریں کہ کون سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، جنّی یا اِنسی؟ میں بتاؤں گا، جنّی نہیں اِنسی۔ جو اِنسی شیاطین ہیں جو اِس دُنیا میں رہتے ہیں وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں گمراہ کر دینے کے لئے۔ کیوں؟ ہماری اُن سے رسائی اور اُن کی ہم سے رسائی ہے یعنی وہ اِس دُنیا میں رہتے ہیں، ہم اُن کو دیکھتے ہیں وہ ہم کو دیکھتے ہیں، ہم اُن کو سنتے ہیں اور وہ ہم کو سنتے ہیں۔ لہٰذا زیادہ گمراہی کا امکان یہیں پر ہے اور دوسرے جو جنّی ہیں وہ مجبور ہیں، لاچار ہیں، بے دست و پا ہیں، کام نہیں کر سکتے ہیں جب تک، جب تک اِنسی شیاطین کی ہم سے رسائی نہیں ہوتی ہے، جب تک وہ ہم کو گمراہ نہیں کرتے ہیں، ہمارے دل میں وسوسے نہیں ڈالتے ہیں، اپنی طرف متوجّہ ہم کو نہیں کر سکتے ہیں تو تب تک وہ جنّی شیاطین منتظر رہتے ہیں۔ قرآن میں ہے کہ: جنّی شیاطین اور اِنسی شیاطین کی آپس میں ملاپ ہے، وہ ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہیں (۶:۱۱۲)۔

میں اِس کی حکمت آپ کو بتاؤں، کس طرح کرتے ہیں؟ مثلاً ایک مومن تھا، مثال ہے، تو اُس مومن نے اِنسی شیاطین کے ساتھ رابطہ کیا۔ ایک مومن نے اِس دُنیا کے اندر اِنسی، انسانی شکل کے شیاطین کے ساتھ اُس نے رابطہ کیا، تو جنّی شیاطین جو منتظر تھے کچھ اشارہ پانے کے لئے، اب اُن کو اشارہ مل گیا۔ کہاں سے ملا؟ اِس مومن کے (through) سے

اشارہ ملا۔ جب ایسا مومن عبادت میں بیٹھے گا تو وہ جو جنّی شیاطین ہیں اِس کے دل میں وسوسے ڈالنا شروع کر دیں گے، پھر اِس کی وضاحت کی ضرورت ہے کیونکہ بات ابھی (clear) نہیں ہوئی ہے۔ یہ کہ دُنیا کے اندر کچھ امام کے دشمن ہیں، (suppose) وہ امام کے دشمن اِس معنیٰ میں ہیں کہ کچھ مومنین کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں، تو اِن میں سے ایک دو مومن ایسے سادہ تھے اور کچھ نہیں سمجھتے تھے کہ اُن کی باتوں کی طرف متوجّہ ہو گئے اور ظاہری علم کے حساب سے یا کسی لحاظ سے یا کہ چکنی چپڑی باتوں کے لحاظ سے اُن کی طرف متوجّہ ہو گئے، تو پھر اُسی روز سے اِن کے دل میں جنّی شیاطین کام کرنے لگیں گے۔ جب بھی عبادت میں بیٹھیں گے یا کچھ نیکی کی طرف توجّہ دیں گے تو اِن کے دل میں وسوسے آنا شروع ہو جائیں گے تو یہ وسوسے کہاں سے پیدا ہو گئے؟ وہ جو جنّی شیاطین منتظر تھے کچھ موقع پانے کے لئے تو اب اِن کو موقع ہو گیا۔ تو پھر یہ کس طرح وسوسہ ڈالیں گے؟ وہی باتیں جو اِس سادہ لوح مومن نے دوسروں سے کچھ باتیں جو سنی تھی وہی باتیں اِس کے دل میں گھومنے لگیں گی اور اِنہی سے فائدہ اُٹھا کے اُن کو کچھ دل میں وسوسہ ڈالنے کے لئے موقع ملے گا جو جنّی شیاطین ہیں، تو ایک دوسری مثال اِس سلسلے میں۔ ایک مومن ہے بدقسمتی سے وہ ایک دن کسی کے ساتھ جھگڑا کرتا ہے، چاہے اُس شخص کی غلطی ہے یا اِس کی غلطی ہے یا غلطی میں دونوں مساوی ہیں تو کچھ آپس میں تکرار ہوتی ہے، کچھ باتیں ہوتی ہیں، کچھ غصّے ہوتے ہیں وغیرہ۔ وہاں سے آ کے یہ عبادت پر بیٹھتا ہے تو کیا کیفیت گزرتی ہے؟ اِس کے دل میں پھر وہی باتیں گھومتی ہیں، وہی باتیں گھومتی ہیں، وہی باتیں آتی ہیں، وہی چیزیں آتی ہیں، عبادت سے اس کو کوئی مزہ نہیں آتا ہے۔ ابھی دیکھا اِس مثال میں شیطان نے ہاتھ ڈالا، کہاں؟ وہ جو سرگزشت گزری تھی، وہ جو واقعہ ہوا تھا، یہ جھگڑے جو ہوئے تھے، اِنہی چیزوں میں سے شیطان نے کام شروع کیا۔ نہیں تو یہ باتیں فراموش ہونی چاہئے تھیں۔ فراموش کیسے؟ شیطان اِنہی چیزوں کو استعمال کرے گا، اِنہی کو وسوسہ بنائے گا اور اِنہی سے اِس کو گمراہ کرے گا اور عبادت میں رکاوٹ اور غیر سکونی کیفیت بنائے گا۔ بالکل اِسی طرح سے دُنیا کے اندر جو اِنسی شیاطین ہیں جو انسانی شکل میں ہیں، اُن کے ساتھ جو دوستی رکھے گا تو اِس کی سزا یہ ہوگی کہ جو جنّی شیاطین ہیں وہ اِس پر غالب آئیں گے اور ہر طرح سے اِس کے دل میں وسوسے ڈالیں گے، عبادت سے روکیں گے اور ایسے رستے پر ڈالیں گے کہ وہ گمراہی کا راستہ ہے۔ میرا مقصد ایک مثال کو پیش کرنا تھا، میں یہ چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ دوست اور دشمن کی شناخت ضروری ہے دُنیا کے لئے، کون سے دوست اور کون سے دشمن؟ دین کا دوست اور دین کا دشمن۔ دُنیا کی کوئی بات جو ہے وہ دُنیاوی طور پر گزرنے والی ہے یعنی خطرے کی بات جو ہے وہ دین کے معاملے میں کسی کی دشمنی سے ہو سکتا ہے تو اِس لئے مومن کو رُوح القدوس کا فیض نہیں ملتا ہے جو امام کے دشمنوں کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ آپ پیر پندیاتِ جوانمردی کو اُٹھا کے اُس کے اندر دیکھیں، اگلے زمانے میں کسی پیغمبر کو وحی آئی، شاید موسیٰ علیہ السّلام کو وحی آئی کہ وہ کچھ لوگوں سے کہیں کہ وہ غیروں کے ساتھ اُٹھا بیٹھا کرتے ہیں، اُن سے دوستی کیا کرتے ہیں تو خدا نے

اُن کو آگاہ کیا مابعدہ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی اُن جیسے ہو جائیں لیکن ایک بات میں کروں۔ یہ قلبی دوستی منع ہے، قلبی دوستی، دل کے اندر اور دُنیا کے اندر، بہت سے ہم یہود و نصاریٰ کے ساتھ ظاہری اور سطحی دوستی کر سکتے ہیں، اِس کے بغیر کام نہیں چلتا ہے لیکن ہم قلبی طور پر اُن کے ساتھ دوست نہ ہو جائیں یعنی ہماری قلبی دوستی امام کے بعد امام کے مریدوں سے ہونی چاہئے تا کہ رُوح القدوس ہم کو اپنا فیض پہنچائے۔ رُوح القدوس ایسے مومنین سے بھاگ جاتی ہے جو امام کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں، دینی دوستی، قلبی دوستی اور گہری دوستی۔ یہ ہے، دیکھا کہ امامؑ کی دوستی کے لئے بھی کیا چاہئے؟ دوستی چاہئے، کن سے؟ امامؑ کے دشمنوں سے نہیں، امامؑ کے مریدوں سے، ہمارے اندر ایک عادت ہو، بڑی دوستی کے لئے ہم چھوٹی دوستی کو (step) بنائیں۔ امام کی رُوحانی اولاد کو چاہیں اور اُن کے خیر خواہ ہو جائیں اور جب ہم امام کے فرزندوں کو چاہیں گے تو اِس کا (result) کیا نکلے گا؟ اِس کے (opposite) کی بات بنے گی؟ یہ کہ ہم دوسروں کو نہیں چاہیں گے، کن کو؟ یعنی غیر نظریات کو، نہ چاہنے کی بات ہے اور کسی سے ایسی جسمانی دشمنی رکھنے کا کوئی سوال نہیں ہے، تو ہم یہ نظریات اور عقائد کی بات کرتے ہیں۔

میں نے کہا، بہت اچھی مثال ہے کہ بڑی دوستی کے لئے چھوٹی دوستی کو (step) بنائیں یعنی مولا کی رُوحانی اولاد کو چاہیں اور کسی مومن سے دشمنی نہ کریں، مومن سے دشمنی جو ہے وہ باعثِ نقصان ہے۔ دیکھیں! ہمیں جو دُعا کرنے کے لئے سکھایا گیا ہے وہ بھی دائرۂ ایمان ہی کے اندر محدود ہوتی ہے اور صحیح معنوں میں جو ہمیں دُعا کرنی چاہئے وہ مومنین کے حق میں دُعا کرنی چاہئے۔ قرآن یہ کہتا ہے، ایمان یہ کہتا ہے، دین یہ کہتا ہے اور اِسی طرح ہمیں مومنین کا خیر خواہ بن کر رہنا ہے، اُن کی بھلائی چاہنا ہے، اُن کے لئے نیک [خیر] سگالی کرنی ہے، خیر خواہی کرنی ہے، اُن سے مذہبی اور رُوحانی صورت میں دوستی رکھنی ہے تا کہ پھر اِس کے بعد امامؑ کی دوستی آسان ہو جائے اور آپ کو ایک اور بات بتاؤں جو اہم ہے۔ سلمان فارسی اپنے وقت میں ایسے تھے کہ وہ صرف مومنین کو چاہتے تھے اور جو علی کو نہیں چاہتے تھے اُن کو نہیں چاہتے تھے اور مولا علی صلوات اللہ علیہ کچھ ایسے تھے کہ وہ تو بادشاہ تھے، وہ سمندر تھے، سب کے ساتھ ملتے جلتے تھے لیکن مومن جو ہے وہ ایسے نہیں ہیں۔ اب مثلاً امامؑ ہیں اور ہم ہیں، امام تو نور کا ایک وسیع سمندر ہے، ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ امام کہاں جاتے ہیں، کن کے ساتھ رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں وغیرہ۔ ہماری ہستی محدود ہے، ہماری ہستی ایک لحاظ سے بنی ہی نہیں ہے، ہمیں ایک سانچہ چاہئے، میں نے کبھی سانچے کی بات کی تھی کہ سانچہ چاہئے، وہ عقیدے کا سانچہ ہے، وہ ایمان کا اور امام کی محبّت کا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں دُنیا کے اندر کوئی چیز سانچے کے بغیر نہیں بنتی ہے۔ پھل کو دیکھیں، پھول کو دیکھیں، پھول کے لئے ایک کلی جو ہے غنچہ جو ہے وہ ایک سانچہ ہے اور غنچہ جو ہے یا کلی جو ہے وہ ناوقت کھِل جائے تو نازک نازک پنکھڑیاں جو ہیں وہ برباد ہو جائیں گی، ہوا لگے گی، اُن میں کوئی رنگ نہیں آئے گا، اُن میں کوئی خوشبو پیدا نہیں ہوگی، وہ پھول ضائع ہو جائے گا۔ کوئی پھل ہے، وہ غلاف کے اندر ہوتا ہے، چھلکے کے اندر ہوتا ہے اور مغز بھی جو ہے چھلکے کے اندر ہے، گٹھلی کے اندر ہے، یہ اُس

کا سانچہ ہے تو کسی بھی چیز کو وُجود دینا ہے، ہستی میں لانا ہے، جنم دینا ہے تو اُس کے لئے ایک سانچہ بنتا ہے۔ مرغی کے انڈے کو دیکھا؟ وہ ایک سانچے کے اندر ہے، اُس سانچے کے اندر اُس کو ڈھلنے دو اور وقت سے پہلے اُس کو نہیں توڑنا۔ انسان کا جو بچّہ ہے وہ رحمِ مادر میں، سانچے کے اندر ہے اور وقت سے پہلے اُس کو پیدا نہیں ہونا ہے۔ اِس طرح دُنیا کے اندر جو بھی چیز ہے وہ ایک سانچے کے اندر ہے، دانۂ گندم جو ہے اُس کا ایک چھلکا ہے اور پھر وہ زیرِ زمین دفنایا جاتا ہے تو زمین اُس کے لئے گہوارہ ہے، وہ دانۂ گندم اُس گہوارے میں پرورش پاتا ہے اور جب تک اُس کا وجود نہیں بنتا ہے اُس نے زمین سے سر نہیں اٹھانا ہے۔ اِسی طرح مُرید ہیں تو عقیدت اور دین داری کے سانچے میں ہیں، اِن کو دین سے بالاتر نہیں ہونا ہے اور شاید کوئی وقت آوے تو اُس میں دین سے اِن کو بالاتر ہونا پڑے گا۔ اُس تک اِن کو محدود رہنا ہے اور محدود رہنے کے یہ معنی ہیں کہ دشمن کو دشمن سمجھے اور دوست کو دوست اور دشمن سے یہ مُراد ہے کہ اُس کے نظریات کو، اُس کی باتوں کو، اُس کے عقیدت کو، اُس کی تعلیمات کو نہیں اپنانا ہے، تو میں نے سلمان فارسی کی مثال دی ہے، سلمان فارسی ایسے تھے کہ وہ دوسروں کے ساتھ کوئی خاص رابطہ نہیں رکھتے تھے اور حالانکہ علیؑ بادشاہ تھے، وہ سب کے ساتھ رابطہ رکھتے تھے، سب کے ساتھ ملتے جلتے تھے لیکن چونکہ سلمان میں رُوح القدوس کام کرتی تھی اور رُوح القدوس کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ مومنین کو فیض دینے والی ہوتی ہے اِس لئے وہ دوسروں سے ترکِ تعلقات کرتی ہے یہ ہے۔ اب اگرچہ اِس زمانے میں تبرّا نہیں ہے اسمٰعیلی مذہب کے اندر، یہ بھی کہنا چاہئے کہ ہمارے مذہب کے اندر دوسروں پر لعنت ملامت یعنی طعن و تشنیع نہیں ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ ہم بالکل اُن کے ہو جائیں، ایک اعتدال ہے، تو یعنی اِس کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ ہم دوسروں کو گالیاں دیں۔ اگر ہم دوسروں کو گالیاں دینا شروع کر دیں گے تو ہمارا جو ایمان ہے وہ کمزور ہو جائے گا، سنا آپ نے؟ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم دوسروں کو دین کے معاملے میں بہت جان سے عزیز سمجھیں، ایسا کریں گے تو ہمارا ایمان کمزور ہو جائے گا۔ یہ محض اپنا ایک نظریہ ہے، اُس کو عزیز رکھنے کے (sense) میں ہے، اُسی کے لئے ہے۔ باقی انسانی حد میں، انسانی (level) پر، انسانی ہمدردی وہ صحیح ہے، اُس کے لئے کب منع ہے؟ لیکن ہمارے اندر جو ایمان ہے اُس کو خالص رکھنا ہے، اُس کو کسی کے ساتھ آلودہ نہیں کرنا ہے، اُس میں کوئی آمیزش نہیں ہونی چاہئے اور اخلاقی طور پر اسماعیلیوں سے بڑھ کر کون لوگ اچھے ہو سکتے ہیں؟ یہ تو اچھے ہیں مگر ایمان اپنا ایمان ہے، نظریہ اپنا ہے، تعلیمات اپنی ہیں، ہدایت امامؑ کی ہیں، ہمیشہ ہے اور اگر ہم خود کو دوسروں کی تعلیمات کے لئے محتاج قرار دیں [یعنی] دینی تعلیمات [کے لئے] تو یہ سب سے بڑی ناشکری ہوگی اور حالانکہ لاشعوری طور پر دُنیا والے ہمارے امام کی تعلیمات کے محتاج ہیں، وہ جانیں یا نہ جانیں، وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، اِس صورت میں ہم اگر دینی طور پر اور نظریاتی طور پر کسی کی طرف جھکتے ہیں تو یہ سب سے بڑی ناشکری ہوگی اور پھر رُوح القدوس ہم کو کچھ نہیں دے گا، کچھ نہیں دے گا۔ یہ باتیں ہیں اور اتفاق سے اور اب ہم اپنی

گفتگو کو ختم کرتے ہیں، بہت شکریہ کہ آپ نے مکمّل طور سے توجّہ دی اور غور سے باتوں کو سُن لیا اور پھر اِس مجلس کو جو آپ نے رونق بخشی ہے اُس کے لئے جو کچھ شکریہ کرنا ہے وہ کوئی ہمارا عملدار کرے گا اور جس طرح دُعا کرنی ہے وہ بھی کوئی ممبر کرے گا اور اِن دو چیزوں سے پیشتر آپ کے پاس کوئی فوری یا ضروری سوال اِن باتوں سے متعلّق ہو تو کوئی بات نہیں ہے آپ ایسا کوئی سوال کر سکتے ہیں۔

یہ بھی ایک نکتہ ہے کہ پیغمبر اور امام کی اکثر چیزیں اپنانی ہوتی ہیں یعنی اُن کے قول و فعل سے اکثر باتیں اپنانی ہوتی ہیں مگر چند چیزیں ہوتی ہیں جن کا تعلّق اُن کی اپنی ذات سے ہوتا ہے اور یہ جاننا چاہئے کہ وہ کون سی چیز ہے جس کا تعلّق صرف امام کی ذات سے ہے، انسانِ کامل کی ذات سے ہے؟ اور کون سی چیز ہے جو ہمارے لئے باعثِ تقلید اور واجبُ العمل ہے؟ یہ جاننے کی بات ہے دانشمند مومن کو۔ زمانۂ رسولؐ میں کچھ باتیں ایسی تھی جو کہ وہ رسولؐ کے لئے خاص تھیں اور باقی اکثر و بیشتر چیزیں ایسی تھیں جن پر اور جن کے مطابق افرادِ اُمّت کو عمل کرنا تھا۔ اِسی طرح چونکہ موضوع کچھ اِس طرح سے چلتا تھا کہ میں یہ بات آپ کو بتاؤں کہ موجودہ وقت میں جو ہم امام کے پیرو ہیں، مُرید ہیں ہم پر واجب ہے کہ بہت ساری باتیں امام کے مطابق عمل کریں لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلّق ہمارا یہ نظریہ ہونا چاہئے کہ یہ تو امام کے لئے خاص ہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ امام ہر کام کے کرنے کے بعد یہ نہیں فرماتے ہیں کہ تم بھی ایسا کرو، جو ہمیں جو کچھ کرنا چاہئے اُس کے لئے ہم کو ہدایت دیتے رہتے ہیں مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اگر کوئی کام امام دُنیا کی سطح پر کرتے ہیں یا اسلام کی سطح پر کچھ کام کرتے ہیں تو اُس کے متعلّق فوراً کہا ہو کہ چونکہ میں نے یہ کام کیا ہے تو تم بھی ایک دم سے اِس پر عمل کرو۔ ایسا نہیں فرمایا گیا، اور چونکہ امام کی مختلف حیثیتیں ہیں، امام جانشین رسولؐ بھی ہیں اور امام اسماعیلیوں کے امام بھی ہیں اور امامؑ آج کی دُنیا میں ایک (international) شخصیت بھی ہیں۔ یہ بات یاد ہونی چاہئے یعنی امام چاہتے ہیں کہ جس حد تک ہو سکے بین الاقوامی سطح پر دُنیا والوں کو کچھ فائدہ دیں، کچھ میں نے جو بات کہی وہ ظاہر میں ہے اور باطنی طور پر تو یعنی وہ امام ہیں، نورِ خدا ہیں۔ اب جو کام (international level) پر ہو تو ہم اُس کو نہیں کر سکتے ہیں اور جو کام اسلام کی سطح پر ہمارے اِس طریقے سے انجام دیتے ہیں وہ بھی ہم نہیں کر سکتے ہیں۔ ایک اسمٰعیلی کی حیثیّت سے اور امام کے ایک مُرید کی حیثیّت سے اُس کے اُس ہدایت کے دائرے میں رہتے ہوئے جو اسماعیلیوں کے لئے خاص ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جب وہ اسلام کی سطح پر فرمانے لگیں گے تو اُس سطح کے مطابق فرمائیں گے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ امام جہاں (international affairs) میں نمایاں کردار انجام دیتے ہیں تو اُس سطح کے مطابق فرمائیں گے۔ ہمیں اِن چیزوں کو دیکھنا ہے، سوچنا ہے، سننا ہے لیکن ہمارا جو عمل ہے وہ اپنے دائرے میں محدود ہونا چاہئے یعنی دائرۂ اسماعیلیت میں اور اِس اشارے میں، مَیں کیا کیا چاہتا تھا وہ بعد میں آپ کو بتاؤں گا۔ کبھی مجھ سے سوال کرنا کہ آپ کے اِس مختصر بیان کا کیا

مقصد تھا اور آپ کے سامنے اُس وقت میں کیا کیا چیزیں تھیں تو میں آپ کو بتاؤں گا۔

آدم علیہ السّلام پیغمبر بھی تھے اور امام بھی، اِس کی دو وجہیں ہیں۔ اگر ہم مان لیتے ہیں کہ آدمؑ سے پہلے لوگ نہیں تھے تو لازمی طور پر امامت کی بنیاد اور نبوّت کی بنیاد پر آدمؑ ہی کو ہونا ہے کیونکہ امامت بھی بہت پہلے سے ہے جس طرح نبوّت بہت پہلے سے ہے اور دوسری وجہ اگر لوگ تھے پھر بھی وہاں پر دَور جو تھا وہ ختم ہو چکا تھا اور دَور ختم ہونے کے بعد آدمؑ سے ایک نئے دَور کا آغاز ہو رہا تھا، اِس صورت میں بھی پیغمبر کو اور امام کو ایک ہونا تھا، یہ دو باتیں ہو گئیں۔ اِس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ نبوت اور امامت اندر اندر سے ایک ہوتی ہے، وہ ایک نور ہوتا ہے اور نور ایک ہوتا ہے۔ ہم نے کبھی یہاں پر گزشتہ مجلس میں شاید نور کے بارے میں گفتگو کی تھی اور نور کے ایک ہونے کا ذکر ہوا تھا اور اُس میں بہت سے ممبروں نے اچھی طرح سے توجّہ دی تھی اور خوب سمجھ لیا تھا۔ اِسی طرح پیغمبر اور امام اگرچہ شخصیت میں الگ الگ ہیں لیکن نورانیت میں اور رُوحانیت میں وہ ایک ہوتے ہیں۔ لہٰذا آنحضرتؐ نبوّت اور امامت دونوں درجات سے وابستہ تھے یا یوں کہنا چاہیئے کہ محمّدؐ اور علیؑ باطن میں اور نور میں ایک تھے اور اِس لئے نبوّت اور امامت کے ایک ہونے میں ذرا بھی تعجّب نہیں ہے۔ رہا کام اور ظاہری پروگرام خدا کا، یہ تو بات الگ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد یعنی کارِ نبوّت جو ہے اُس طرح سے نہیں ہونا چاہیئے جو زمانۂ رسالت میں تھا مثلاً یہ کہ ایک نئی وحی نازل ہو، یہ کہ ایک شریعت میں اضافہ ہو، یہ کہ قرآن میں (add) کیا جائے، تو اِس معنیٰ میں آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور آنحضرتؐ خاتم الانبیاء ہیں اور خاتم الانبیاء کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نور جو ہے وہ ختم ہو گیا۔ نور ہے تو قرآن نازل ہو گیا، قرآن مکمّل ہو گیا، اب قرآن کے اندر جو بے پناہ حکمتیں ہیں اُن کا سلسلہ جاری رہے گا یعنی قرآن ظاہری طور پر جو نازل ہوتا ہے تو اُس کو تنزیل کہا جاتا ہے اور اِس تنزیل کے اندر جو حکمتیں ہیں، جو تاویلات ہیں اُن کو آہستہ آہستہ بیان کرنا یہ تاویل ہے، تو یہ بھی بہت بڑا کام ہے، یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ قرآن کی تاویل جس طرح امام بیان کرتا ہے وہ ہر کوئی کرے، ہر کوئی کر سکتا تو کر سکتا۔

یہ ایسا ہے کہ نبوّت اور امامت کے (interlink) درجات ہوتے ہیں۔ ظاہری لحاظ سے دیکھا جائے جس طرح سب انبیاء آنحضرتؐ کے برابر نہیں ہیں، جس طرح سب انبیاء چھ بڑے پیغمبروں کے برابر نہیں ہیں تو مختلف درجات پر پیغمبر آئے ہوئے ہیں۔ اِس طرح امامت کے بھی کئی درجات ہیں کہ یہ امامت کئی لحاظ سے نبوّت کے کئی درجات سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ تاہم یعنی یہ نبوّت کے درجات اور امامت کے درجات باہم ملے ہوئے ہیں۔ کوئی درجہ آگے ہے کوئی پیچھے ہے، تو آپ امامت کی تاریخ سے متعلّق جو کتاب ہے اُس کو اُٹھا کے دیکھیں گے تو اُس میں کم سے کم بڑے درجے امامت کے پانچ ہیں، کبھی آپ کو بتائیں گے یا میرے خیال میں کسی مقالے میں یہ بات آچکی ہو گی، بہت دفعہ ہم چونکہ ہم لکھتے ہیں، تو ابراہیمؑ سے جس طرح خطاب ہوا تو اُس کا مطلب تھا یعنی نبوّت کے کسی بڑے درجے کی طرف آپ کو لے جایا جاتا

تھااور اِس کےعلاوہ اور بھی اِس میں وُجوہ ہیں۔ایک وجہ یہ بھی کہ کسی ناطق پیغمبر کو بھی امام کہا جاتا ہے،اصطلاح کے طور پر یا(literal sense) میں۔آپ دائم الاسلام کو اُٹھا کے دیکھیں گے تو جہاں(chapter) ہے جنائز کا،جنازوں کا تو اُس میں جب رسولؐ وفات پا گئے تو مولا علیؑ نے کہا کہ:''رسولؐ حیات میں بھی اور ممات میں بھی امام تھے''۔اِس کی بھی تاویل ہو سکتی ہے،حیات میں امام تھے یعنی پیشوا تھے شریعت کے،دین کے اور امامت علی کو پیغمبر کے(through) سے ملی تھی اور ممات میں امام ہونے کے یہ معنی ہیں کہ آپ کے جانشین اور امامت صحیح طور سے دُنیا میں زندہ شخصیت کی شکل میں مجسم ہو کے باقی ہیں۔بہر حال یعنی ہمارے بزرگانِ دین نے جو بڑے چھ پیغمبر ہیں اُن کو اور آنحضرتؐ کو امام کے نام سے بھی یاد کیا ہے،جہاں امام کوئی بڑا مرتبہ ہے تو پیغمبر کو بھی اُس مرتبے کے قریب آنا ہے۔

امامؑ کے درجات میں سے ایک تو امامِ مقیم ہیں،امامِ مقیم اِس طرح سے ہے کہ امامِ مقیم ایک ناطق پیغمبر کو رُوحانی تربیت دے کے تیار کر سکتے ہیں جیسے آدمؑ کو،نوحؑ کو،ابراہیمؑ،موسیٰؑ،عیسیٰؑ،آنحضرتؐ کو،یہ امامِ مقیم ہے جو سب سے بڑا درجہ ہے۔اِس کے بعد اساس کا درجہ ہے،اساس کا درجہ ہے،یہ دو درجے ہوئے اور تیسرا درجہ متم کا ہے،امامِ متم یعنی سات کے دَور کو مکمّل کرتا ہے،تیسرا یہ ہے۔چوتھا جو ہے امامِ مستقر ہے کہ اُس کی نسل میں امامت برقرار ہے۔پانچواں درجہ امامِ مستودع ہے کہ ایک پشت یا دو پشت کے لئے امامت اُس کو آئی ہے پھر وہاں سے امامت لوٹ کے مستقر میں جاتی ہے،یہ پانچ درجے ہیں اور اِس کے علاوہ قائم القیامت کا بھی تصوّر ہے۔قائم چونکہ قائم القیامت ہے اور قائم القیامت کو پیر ناصرِ خسرو نے بزرگوارِ دو جہان کہا ہے،دونوں جہان میں عظیم ہے۔

سود کی تاویل یہ ہے کہ امام کو پہچانا جائے،اُس کی تابعداری کرتے ہوئے محنت کی جائے اور اِس محنت کے نتیجے میں امام کی ہدایت اور رُوحانی علم حاصل کیا جائے،یہ تجارت ہے اور امام کی تابعداری کے بغیر کتابوں سے تیار علم لے کے اُس یعنی اسلامی زندگی گزارنے کی کوشش،یہ سود ہے۔وہ تو مفت کی چیز ہوگئی،مشقّت اور تجارت نہیں ہوئی یعنی آخرت کی تجارت یہ ہے کہ امام کی تابعداری کی جائے محنت و ریاضت کی جائے،امام کی ہدایت کو قبول کیا جائے اور رُوحانی علم کو جس طرح سے بھی ہو خواہ پیروں کے ذریعے سے،اماموں کے ذریعے سے اور ذاتی طور پر،یہ تجارت ہے،محنت و مشقّت ہے اور جو شخص امام کو چھوڑ کے براہِ راست پڑھا ہوا علم کتابوں سے اور قرآن سے،حدیث سے لے کے یعنی دینی زندگی گزارنا چاہتا ہے،یہ سود ہے اور سود ہے اُس کو کوئی فائدہ اِس سے نہیں ہے اور ایسا کرنا حرام ہے۔

ٹرانسکرائب:یاسمین لاسی ٹائپ:ثناء وزیر علی نظرِ ثانی:اکبر علی پروف:نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: برُشسکی گنان: نورہ ھرلتن دیارد (دیوانِ نصیری صفحہ نمبر ۲۵۰)، قصّہ یوسفؑ کی تاویل، علمی اور نورانی دیدار

Click here for Audio

کیسٹ نمبر: ۶۴ تاریخ: جنوری، ۱۹۸۲ء کراچی

نورہ ھرلتن دیارد: ایک نورانی بارش کے برسنے سے اور ایک نورانی بارش برس کر۔ [کچھ گنگناہٹ]

یہاں پر ایک نظم موجود ہے، اِس نظم میں مولا کے عاشقوں کے احوال کی ترجمانی کی گئی ہے کہ کس طرح بارانِ رحمت برستی ہے اور عاشقوں کی آنکھوں کے آنسوؤں کے اندر ایک نورانی بارش کس طرح پوشیدہ ہے اور وہ کس طرح برسا کرتی ہے، اُس کی ترجمانی کی گئی ہے اور اِس نظم کا ٹائٹل ہے یعنی عنوان ہے "نورہ ھرلتن دِیارد"۔ [کچھ گنگناہٹ]

۱۔ دین کیا ہے؟ مومنین کا وطن ہے۔ دین مومنوں کا دیس ہے تو یہ دیس، یہ وطن ہنسے گا کب؟ اُس وقت جب کہ اِس دین کے وطن پر ایک نورانی بارش برسے گی۔ مومنین کی رُوحانی ہستی میں ایک عقلانی چمن بھی ہے تو یہ عقل کا چمن اُس وقت ہنسا کرے گا جبکہ اِس پرنورانیت کی ایک بارش برسے۔ وہ نورانی بارش کس طرح برسے گی؟ وہ نورانی بارش امامؑ کے علم کی صورت میں اور اُس کی ہدایت کی صورت میں برسا کرے گی۔

۲۔ اگر زمانے کا بادشاہ یعنی امامِ زمان آسمانِ رحمت بن کر آئے تو اُس وقت جسم بھی اور رُوح بھی ہنسے گی کیونکہ امام کی تشریف آوری سے تو لازمی طور پر ایک نورانی بارش برسے گی جو کہ عاشق کے اپنے آنسوؤں کی صورت میں ہوگی تو اُس وقت اِس نورانی بارش کے برسنے سے یعنی امام کے ارشادات کی بارش برسنے سے رُوح بھی ہنسے گی اور بدن بھی۔

۳۔ جان کی بستی، جان میں ایک بستی ہے، ایک رُوحانی بستی ہے اور ذکر کیا ہے؟ وہ تو ایک باغ ہے تو یہ جان کی بستی اور ذکر کا باغ جب نور کی بہار آئے، جب نورانیت کی بہار آئے تو یہ جان کی بستی اور ذکر کا باغ آشکار طور پر بھی اور پوشیدگی میں بھی ہنسے گا۔ اِس لئے کہ اُس وقت اِس پرنور کی ایک بارش برسے گی۔

۴۔ جب خداوند کا رُوحانی دیدار ہوتا ہے تو اُس دیدار کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اور ایک اہم شکل یہ ہے کہ خداوند رُوحوں کا ایک طوفان بن کر آتا ہے یعنی امامِ زمین و زمان کی رُوحانی تشریف آوری کی مختلف صورتیں ہوا کرتی ہیں، اور سب سے بڑی صورت تو یہ ہے کہ امامِ زمین و زمان رُوحوں کا ایک طوفان بن کر آتا ہے، وہ تو قرآن کی حکمت بن کر آتا ہے

اور ہماری اِس گفتگو کی جان تو وہی ہے۔ جب عاشق روئے، آنسو بہائے اور اُس میں سے رحمت کی ایک بارش برسے تو لازمی بات ہے کہ اِس میں رُوح کا طوفان اُٹھے گا اور خداوند حکمت کا قرآن بن کر تشریف فرما ہو جائے گا اور یہ سب کچھ کب ہو گا؟ یہ سب کچھ اُس وقت ممکن ہے جبکہ امام کی ہدایت ہو، جبکہ امام کی رحمت ہو، جبکہ امام کی طرف سے علم کی بارش برسے تو اُس وقت یہ سب کچھ ہو جائے گا۔

۵۔ اب فکر کے بادل تو چھا گئے، فکر کے بادل چھا گئے اور عشق کا جو آسمان ہے وہ اب رونے لگا، اور نتیجے کے طور پر سرّ و اور سمن یعنی چنبیلی باغ میں ہنسنے لگے گی نور کی بارش کے برسنے سے۔

۶۔ [برشسکی اور ترجمہ آڈیو میں موجود نہیں ہے]

۷۔ پہاڑوں پر ایک پھول ہوا کرتا ہے، اُس کا نام ہے اُس علاقے کے مطابق مقدّس پھول یعنی پاک پھول۔ تو جب کبھی بارش برستی ہے یا شبنم بیٹھتا ہے [گرتی] ہے تو اُس کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے موتی کی طرح جھلکنے لگتے ہیں اور عجیب خوش نُما منظر ہوتا ہے کہ مقدّس پھول کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے موتی جیسے لگتے ہیں اور جھلکتے ہیں۔ بالکل اِسی طرح سے عاشق کے چہرے پر آنسوؤں کے قطرے اُن موتیوں کی طرح ہیں اور اُن شبنم کے قطروں کی طرح ہیں جو مقدّس پھول کی پنکھڑیوں پر نظر آتے ہیں تو یہ گویا موتی ہیں۔ اب اُس مقدّس پھول پر جو بارش برسی ہے اُس کو اِس پانی سے فائدہ ملے گا اور وہ شاداب ہو جائے گا، تر و تازہ ہو جائے گا، ہنسنے لگے گا۔

۸۔ یہاں پر دل کو ایک کلی سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ دل ایک کلی ہے، دل ایک غنچہ ہے تو جس طرح کسی باغ کی کوئی کلی پانی کے نہ ملنے سے اور بارش کے نہ برسنے سے سوکھ کر جُھک جاتی ہے اِسی طرح میرے دل کی کلی جو ہے وہ خشک ہو کر جُھک رہی تھی اور رو رہی تھی، کیوں؟ اِس لئے کہ اُس کو آبِ رحمت چاہئے تھا، بارانِ رحمت چاہئے تھا تو میرے دل کی کلی جو ہے وہ سوکھتے ہوئے اور مُرجھاتے ہوئے جُھک رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اب یہ اُٹھ کر اور سیدھی ہو کر ہنسنے لگے گی اِس لئے کہ اب نور کی بارش برس رہی ہے۔

۹۔ اِس سیّارۂ زمین کے بعض حصّے ایسے ہیں کہ جہاں موسمِ سرما میں گویا زمین سردی کی وجہ سے مر جاتی ہے یعنی اُس پر سبزے کا نام و نشان نہیں رہتا ہے، تو مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ موسمِ سرما میں جس طرح زمین مر چکی ہوتی ہے کہ اُس پر چھوٹے چھوٹے جو جاندار ہوتے تھے وہ یا تو مر چکے ہوتے ہیں یا کسی سوراخ میں دبکے ہوئے بہار کا انتظار کرتے ہیں، تو ایسی زمین سے کہیں کہ نور کی بہار اب آ رہی ہے تو اِس نور کی بہار کے آنے سے یہ مری ہوئی زمین دوبارہ زندہ ہو کر ہنسنے لگے گی اِس لئے کہ اِس پر نور کی بارش برسے گی۔ یہ ساری مثالیں اُس عاشق کی نسبت سے ہیں جو کہ مولا کی محبّت میں، اُس کی یاد میں، اُس کے مقدّس دیدار کے لئے، اُس کی نزدیکی اور قُربت کے لئے آنسو بہاتا ہے تو یہ سب عاشقوں کے

آنسوؤں کی تعریف ہے اور اِنہی آنسوؤں کے اندر ایک نورانی بارش جس میں رُوحانی آبادی ہے، پوشیدہ ہے۔

۱۰۔ تُو عشق کی لذّتوں کو دیکھ اور عقل کی آبادی کو دیکھ۔ نور کی بارش کے برسنے سے جان کا جو وطن ہے، اپنی ہستی میں جو بستی ہے وہ ہنسے گی۔

۱۱۔ نور کی بارشوں کے لئے، نورانیت کی بارشوں کے لئے اور نور کی بارش کے واسطے خود دریا بھی محتاج ہے۔ آپ پوچھیں گے کیوں؟ دریا جب دریا ہے، سمندر جہاں سمندر ہے تو اُس سے ایک حقیر سی بارش کے ساتھ کیا اُس کی نسبت یا اُس کی کیا حاجت؟ یہ بات نہیں ہے یہ دیکھیں اگر اِس دُنیا کے اندر بارش نہ برسا کرے تو لازمی بات ہے کہ ندّی، نالے، دریا اور یہاں تک کہ سمندر جو ہے اُس کا وُجود بھی ختم ہو جائے گا، اُس کا کام کیسے چلے گا؟ سمندر اگر قائم ہے تو ایک (circle) سے اور اِس (circulation) سے قائم ہے کہ کوئی شک نہیں کہ وہی بارش برساتا ہے لیکن اپنی برسائی ہوئی بارش کو وہ واپس لیتا ہے۔ اِس طرح رُوحوں کا جو مرکز ہے، جو رُوحِ کُلّی ہے اُس کو چھوٹی چھوٹی رُوحوں کی حرکت چاہئے، عمل چاہئے، قول چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مقدّس کے اندر ارشاد ہوا ہے کہ: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ '' (۴۷:۷) اے ایمان والو! اگر تم خدا کی مدد کیا کرو گے تو اِس کے بدلے میں خداوندِ عالم بھی تمہاری مدد فرمائے گا اور تم کو دین و دُنیا کے نیک کاموں میں ثابت قدم رکھے گا، تمہاری دستگیری فرمائے گا، تم کو آگے بڑھائے گا، تم کو ترقّی دے گا، تو دیکھا آپ نے؟ اِس ارشاد میں ایک خاص بات کو آپ نے سُن لیا، وہ یہ کہ خداوندِ عالم اہلِ ایمان سے مدد چاہتا ہے، تو اِسی طرح اگر خداوند رُوحوں کا سمندر ہے تو اُس کے لئے بارش کے برسنے کی ضرورت ہے یعنی امام جو رحمت مومنین کو دینا چاہتا ہے اُس کے لئے مومنین کی یہ مدد ہو کہ وہ آنسو بہائیں، بارش برسائیں تا کہ اِس بارش کے باطن میں ایک نورانی اور رُوحانی بارش پوشیدہ ہو سکے۔

۱۲۔ کہتا ہے کہ علم کے باغ کے ایک کونے میں، درمیان میں نہیں، علم کے باغ کے ایک کونے میں میری ہستی گویا ایک درخت ہے۔ میری ہستی ایک درخت ہے علم کے باغ کے درمیان میں نہیں، کسی گوشے میں، کسی کونے میں۔ اب میری ہستی کے اِس درخت کو بھی اِس نورانی بارش سے یوں فائدہ ہوگا کہ اِس کا تنا، اِس کی جڑیں اور اِس کی شاخیں اور اِس کی چوٹی اِس نورانی بارش سے سرسبز و شاداب ہو جائے گی۔

۱۳۔ ہمارے رُوحانی محبوب کی مختلف حیثیتیں ہیں، وہ مختلف حیثیتوں میں آسکتا ہے۔ ایک وہ اِس طرح سے بھی آ سکتا ہے کہ ہمارے دل کے اندر ایک میٹھی محبّت بنے۔ جب عاشق کے دل میں ایک میٹھی محبّت کا غلبہ پیدا ہوتا ہے تو سمجھ لینا کہ اُس وقت وہ جانان اُس محبّت کی حیثیّت میں تشریف فرما ہے۔ اِس لئے کہتا ہے، ہمارے دلوں کے اندر ایک شیرین اور ایک میٹھی محبت بن کر آ۔ ایک پاکیزگی اور صفائی کا سرچشمہ بن کر آ۔ اِس میں یعنی پاکیزگی اور صفائی کے سرچشمے

سے یہ مراد ہے کہ بیشک امام جس طرح اپنے مُریدوں کو، مومنوں کو اور خاص کر اپنے عاشقوں کو جس طرح وہ پاک کیا کرتا ہے اُس لحاظ سے امام ایک چشمہ ہے پانی کا، صاف و شفاف کہ وہ چشمہ پانی کا انسانوں کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے۔ لوگ اُس چشمے پر جا کر اپنے جسم اور لباس کی شستہ شوئی کیا کرتے ہیں، اُس میں سے پیتے ہیں، اُس میں سے نہاتے ہیں۔ اُس کے وسیلے سے ظاہری پاکیزگی اختیار کرتے ہیں تو بالکل اِسی طرح امام ہی ہے جو صاف اور پاک چشمہ ہیں علم کا، نور کا، رُوحانیت کا، ہدایت کا اور امام اِس حیثیّت سے اپنے مُریدوں کو پاک اور پاکیزہ کیا کرتے ہیں۔ قرآن میں آپ کو ایسی بہت سی آیات ملیں گی کہ جن کے اندر پاکیزگی کا ذکر آتا ہے، آپ اُن آیات کی گہرائی میں ذرا جا کر دیکھیں تو ایسا پتہ چلے گا کہ مومنین کی پاکیزگی علم کے وسیلے سے ہوتی ہے اور علم کے وسیلے سے فائدہ اُٹھانے کے لئے سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ امام کی محبّت مومنین کے دل میں ہو کیونکہ محبّت اور اقرار جو ہے وہ بنیادی چیز ہے اسلام میں اور یہ ساری پاکیزگی اُس وقت ہوسکتی ہے جبکہ نورانیت کی ایک بارش برسے، علم کی بارش برسے، ہدایت کی بارش برسے اور اُس کے لئے وسیلہ جو ہے وہ مومن کی اپنی آنکھوں کے، اپنی آنکھوں کے آنسو چاہیئے۔

۱۳۔ دیکھیں کہ یہ اُصول ہے کہ جب عاشق روتا ہے تو معشوق ہنستا ہے۔ جب امام کی تشریف آتی ہے تو کئی عاشق سر جھکائے آنسو بہاتے ہیں تو اُس وقت خداوند تبسم فرماتے ہوئے اپنا نورانی مُکھ دکھاتا ہے، دیدار دیتا ہے تو اُس کو تو تبسم فرمانا ہے، عاشق کو تو آنسو بہانا ہے۔

۱۴۔ غریب نصیر کی رُوح علم کی بارش کے نیچے پڑی ہے، غریب نصیر کی رُوح علم کی بارش کے نیچے پڑی ہے۔ جس طرح کوئی چیز ہے اُس پر بارش برستی ہے اور وہ بارش کے نیچے پڑی ہے۔ اب نتیجے کے طور پر اِس غریب کی رُوح ہنسے گی نور کی بارش کے برسنے سے، نور کی بارش کے برسنے سے، علم کی بارش کے برسنے سے۔

میں نے کبھی کہا تھا کہ آپ کی عاشقانہ عبادت سے متعلق میں ایک نظم بناؤں گا اور اُس نظم میں آپ کی گریہ وزاری کے اشارے ہوں گے، آپ کی باتیں ہوں گی وغیرہ، چنانچہ یہ نظم اِس طرح سے اِس شکل میں بنی ہوئی ہے تو اِن شاءاللہ یہ نظم جو اہلِ زبان ہیں جو اِس علاقے کے لوگ ہیں وہ پڑھا کرینگے اور وہ شاید اِس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ مولا کو منظور ہو، شکریہ نظم اتنی ہے اور اِس کے ۱۴ شعر ہیں اور میں نے اِس کا مختصر ترجمہ کیا جو کہ اچھی طرح سے ادا نہیں ہوا، بہرحال آپ نے توجّہ دی اِس کے لئے شکریہ آپ کا، مہربانی۔

دو پہلو مسلّمہ ہیں۔ ظاہری اور روایتی پہلو بھی صحیح ہوسکتا ہے کہ خداوند کے معجزات ہوتے ہیں اور ہمیں بہت سی مثالوں میں ظاہری پہلو کو ظاہری پہلو کے طور پر ماننا پڑتا ہے مگر زیادہ سے زیادہ حکمت اِس کے رُوحانی پس منظر میں ہوتی ہے۔ اِس کے روحانی پس منظر میں بہت سی حکمتیں ہیں اور اِس کی تفصیل لمبی چوڑی ہے، میں پھر کبھی بتاؤں گا مگر

حضرت یوسفؑ سے متعلق خوب یاد آیا، کہ آپ نے یاد دلایا کہ جہاں وہ بادشاہ کو اُس کے ایک خواب کی تاویل بتاتے ہیں وہ بہت ہی شاندار ہے مثلاً اُن کو یہ سمجھانا کہ تمہارے یہاں اِس ملکِ مصر کے اندر سات برس فراوانی کے آئیں گے یعنی اُس میں خوب فصل ہوگی، خوب پیداوار ہوگی اور باغ سے، کھیت سے اور زمین سے مکمل اور بھرپور فائدہ ہوگا سات برس تک لیکن بعد کے سات برس ایسے آئیں گے کہ اُس میں قحط پڑے گا اور پہلے سات برس جو فراوانی کے اور اچھی فصل کے جو سات برس ہوں گے وہ اِس لئے کہ اُس میں بہت خوب بارش برسے گی۔ سات برس تک موقع پر، وقت پر بارش برسے گی، وقت پر دھوپ پڑے گی اور جس کے نتیجے میں تمہاری آبادی اور باغ سے، کھیت سے حصول خوب ہوگا لیکن بعد کے سات برس ایسے سخت آئیں گے کہ اگر تم نے پہلے کے سالوں سے کچھ ذخیرہ نہیں کیا تو پھر بہت مشکل آئے گی۔

اِس تاویل کے بھی دو پہلو ہیں۔ ظاہری پہلو یہ ہے کہ واقعۃً اُن کو وہاں ایسا ہی ہوگیا کہ سات برس تک یعنی خوب بارش برسی اور خوب فصل اُٹھائی گئی اور بعد کے سات برس جو ہیں وہ بہت قحط کے آئے۔ اب اِس مثال کا ممثول جو ہے وہ رُوحانیت میں ہے۔ کسی قوم پر بھی اور کسی فرد پر بھی رُوحانیت میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ کچھ وقت طوفانی رُوحانیت کا ہوتا ہے اور کچھ وقت اُس طوفانی رُوحانیت میں جو کچھ کمایا گیا ہے اُس کے تجزیہ کرنے میں، اُس کی تحلیل کرنے میں، اُس کی تاویل کرنے میں، اُس میں سے نتیجہ نکالنے میں، غور کرنے میں، فکر کرنے میں گزرتا ہے۔ مثلاً اسلام اور مسلمان قوم کو لیجئے، تو مسلمان قوم پر دو وقت گزرے ہیں، ایک وقت گزر چکا ہے اور ایک وقت گزر رہا ہے۔ اِن کا پہلا وقت کون سا تھا؟ نزولِ وحی کا وقت تھا، جس میں کہ آسمانی وحی نازل ہوتی رہتی تھی، دیکھیں کہ اُس میں کیا آسانی ہے کہ کوئی بھی سوال ہو تو وحی کے ذریعے سے، پیغمبرؐ کی وحی کے ذریعے سے حل کیا جائے۔ کوئی معاملہ ہے، کوئی قضیہ ہے، کوئی جھگڑا ہے، کوئی ہدایت لینی ہے، کچھ بھی معاملہ ہو تو پیغمبرؐ سے رُجوع کیا جائے اور پیغمبرؐ کے دل کے اندر جیسے ہی اِس بات کی خواہش ہوگی تو تب وحی نازل ہوگی تو اِس طرح سے تصفیہ ہو جائے، ایک وقت یہ تھا۔ میں سب یعنی (on the whole) مسلمانوں کی بات کرتا ہوں، میں کسی ایک فرقے کی بات نہیں کرتا ہوں۔

بعد کا وقت یعنی دشواری کا وقت آ گیا۔ کس طرح؟ وہ تو بعد کا وقت جو ہے وہ وحی کا وقت نہیں رہا، آپ دیکھیں کہ آپس میں اختلافات اور مسائل اور جھگڑے، مناظرے اور تفرقہ، یہ باتیں ہوتی رہیں، تو یوسف علیہ السّلام نے جو اُن لوگوں کو بتایا تھا کہ دیکھو یہ چودہ برس جس میں سے سات برس فراوان سالی کے ہیں اور بعد کے سات برس جو ہیں وہ قحط کے ہیں تو اِس میں مسئلہ یوں حل کرنا ہوگا کہ تم اگلے سالوں سے ایک (stock) کو بچانا، کس طرح بچانا؟ کوئی غلّہ کسی ملک میں سات برس تک رہے تو خراب ہو جائے گا نا؟ اِس کے لئے کہا کہ دیکھو تم فصل کو خوشوں سمیت رکھنا، (stock) کو کھلیان میں اُس کو یعنی گاہ کر [اناج کا گاہ کر بھوسے سے جدا کرنا، گاہنا]، گائے اور بیلوں کے ذریعے سے اِس کو صاف صَوف کر کے نہیں رکھنا بلکہ

اُس کو اِسی طرح سے کاٹ کے رکھنا، ذخیرہ کرنا۔ اِس میں بھی اشارہ ہے، اِس میں یہ اشارہ ہے کہ اِسلام پر بھی وہی قحط آنے والا تھا۔ نزولِ وحی کے بعد، دورِ نبوّت کے بعد قحط آنے والا تھا تو اُس کے لئے یوں ہونا چاہئے تھا کہ قرآن اور وحی کے (stock) کو جو دین کی فصل ہے، ذخیرے کو اِس طرح سے رکھنا چاہئے تھا اور بعد میں اُس فصل میں سے یعنی صاف کر کے اِن کو غذا مہیا کرنا تھا۔ اِس کی تاویل یوں ہے کہ قرآن اور حدیث کے مطلب کو اور اُس کی یہ ذمّہ داری کہ تنزیل سے تاویل کی جائے تو [یہ] امامؑ کے حقیقی جانشین پر چھوڑ دی جاتی اور امام قرآن و حدیث کی تاویل کرتے تو یہ بات ایسی بنتی جیسے کہ یعنی اگلے سات برسوں میں خوب فصل ہوئی اور اُس میں سے ذخیرہ کو رکھا اور اِس کی صفائی جو ہے بعد میں کی گئی، تو مطلب کی بات یہ ہے کہ جب وحی نازل ہوتی ہے، تو اُس وقت اُس کی تنزیلی صورت ہوتی ہے جیسے کسی کھیت میں سے فصل کاٹی گئی ہے، ابھی اُس کی صفائی اور چکّی میں لے جا کر پیسنا، گوندھنا، پکانا اور بہت کچھ کرنا باقی ہوتا ہے۔ یعنی میرا مقصد ہے اگر دین کی ہدایات کو فصل سے تشبیہہ دی جائے تو ہدایات (on the whole) یعنی کام نہیں دیتی ہے، جس طرح کہ کوئی کٹی ہوئی فصل اُسی وقت کھانے کے قابل نہیں ہوتی ہے، اُس میں بہت کچھ کرنا باقی ہوتا ہے۔ اِس میں دو بڑی مضبوط باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ یعنی کسی بھی پیغمبر کا جو زمانہ ہے وہ ایک شان سے نہیں چلتا ہے، ہمیشہ وحی نازل نہیں ہوتی ہے اور اُس کے لئے کوئی جانشین چاہیئے کہ وہ اپنے وقت پر لوگوں کی ہدایت کرے اور اُس فصل میں سے اِن کو صاف کر کے دے، تو میں کہہ رہا تھا کہ انفرادی مثال میں بھی اور قوم کی مثال میں بھی دو قسم کے دَور گزرتے ہیں، تو یوسف علیہ السّلام کے قصّے میں بہت سی باتیں ہیں، بہت سی باتیں ہیں، بہت سی حکمتیں ہیں، بہت سی حکمتیں ہیں، اُن میں سے ایک نمایاں اور خاص حکمت یہ ہے۔

سوال: اپنے پریذیڈنٹ صاحب نے ایک سوال کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ دُنیا کے اندر خدا نے جن انسانوں کو پیدا کیا ہے اُن انسانوں میں سے کوئی یا تو مرد ہوتا ہے یا کوئی عورت ہوتی ہے، لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی مخلوق بھی ہوتی ہے کہ وہ نہ تو مرد ہے اور نہ عورت، درمیان درمیان میں ہے۔ اب تاویل میں، اِن کا پوچھنا ہے کہ تاویل میں بتائیں اِس کی حکمت کہ ایسی مخلوق کی کیا تاویل بنتی ہے؟ اور مرد کی تاویل، عورت کی تاویل اور اُس مخلوق کی تاویل کہ وہ نہ تو مرد ہے اور نہ عورت درمیان درمیان میں ہے، اِس کو مخنّث کہا جاتا ہے، ہجڑا کہا جاتا ہے۔

جواب: یہ ہے کہ ایسی مخلوق خوار ہے جو نہ مرد ہو اور نہ عورت اور اُس کے لئے کوئی حقوق نہیں ہیں، میراث، یہ وہ وغیرہ معاشرے میں کوئی عزّت نہیں ہے، اُس بیچاری مخلوق کو کیوں اِس قدر خوار کی گئی ہے؟ وہ ایک تاویل کی وجہ سے ہے، ایک حکمت کی وجہ سے وہ مخلوق یہ ستم اُٹھا رہی ہے اور وہ تاویل یہ ہے کہ دین کے معاملے میں یا تو مرد ہو کے رہنا ہے یا عورت ہو کے رہنا، کوئی فرق نہیں ہے، فرق اگر ہے تو اِس فرق کے باوجود دونوں کی عزّت ہے، جس طرح دُنیا میں اور

مادّی طور پر اگر عزّت ہے تو مرد کی ہے اور پھر عزّت ہے تو عورت کی ہے، اور کسی کی عزّت نہیں ہے۔ اِسی طرح دین کے معاملے میں جو معلّم ہے وہ مرد ہے اور جو متعلّم ہے وہ عورت ہے، دونوں کی عزّت ہے اور دین کے اندر تیسرے کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اگر عزّت ہے تو دین کے مرد کی عزّت ہے اور اگر عزّت ہے تو دین کی عورت کی عزّت ہے، اُستاد کی عزّت ہے اور شاگرد کی، دونوں کی عزّت ہے اور جو نہ اُستاد ہو اور نہ شاگرد اُس کی کوئی عزّت نہیں، اُس کو کوئی حقوق نہیں، اُس کو کچھ (rights) نہیں ملتے ہیں، تو ایک حدیث ہے جو ''وجہ دین'' کے اندر آئی ہے کہ: ''اَلنَّاسُ اثْنَانِ عَالِمٌ وَ مُتَعَلِّمٌ وَ سَائِرُهُمْ كَالْهَمَجِ ''[وجہ دین دوئم: ص:۴۰۰] لوگ دو ہیں، ایک تو عالم ہے اور دُوسرا متعلّم ہے یعنی اُستاد ہے اور شاگرد ہے اور اِس کے سوا جو بھی ہیں وہ کیڑے مکوڑوں کی مثال ہیں، وہ انسان نہیں ہیں، تو دیکھا دین کے اندر سکھانے کی اہمیت ہے اور سیکھنے کی اہمیت ہے۔ عالم کی اہمیت ہے اور شاگرد کی اہمیت ہے یعنی عالم کی عزّت ہے اور متعلّم کی عزّت ہے، دونوں کی عزّت ہے۔ جس طرح دُنیا کے اندر آبادی، خانہ داری، دونوں سے ہوتی ہے مرد اور عورت، مرد نہ ہو تو عورت کیا عورت ہے؟ اور عورت نہ ہو تو مرد کیا اور کس معنیٰ میں مرد ہے؟ دونوں ایک دُوسرے کے محتاج ہیں، دونوں لازم اور ملزوم ہیں، دونوں انسانیت کے نصف، نصف ہیں اور مل کر انسانیت مکمّل ہو جاتی ہے، تو دین میں بھی اُستاد ہے۔ اگر شاگرد نہیں ہے تو کس معنیٰ میں وہ اُستاد ہے؟ کہاں کا اُستاد ہے اور کس لئے اُستاد ہے اور اُس کے اُستاد ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ دلیل کیا ہے؟ لہٰذا جتنا محتاج شاگرد ہے اُستاد سے علم لینے کے لئے اُتنا محتاج اُستاد ہے شاگرد کو اپنا علم دینے کے لئے تاکہ اُس کی اُستادی کا ثبوت ہو۔

دیکھئے ''وجہ دین'' میں اِس قسم کی ساری باتیں آچکی ہیں۔ دیکھیں یہ دو ہاتھ، کوئی شک نہیں کہ یہ دایاں ہاتھ ہے اور یہ بایاں ہاتھ۔ جب ہم دھوتے ہیں تو دایاں ہاتھ دایاں ہونے کے باوجود اِس سے اِس کی پاکیزگی ہو جاتی ہے گو کہ پانی (right side) پر رہتا ہے یعنی لوٹاوہ (right side) پر رہتا ہے یعنی علم اُستاد کے پاس ہوتا ہے لیکن اِسی علم کے اندر وہ دونوں پاکیزہ ہو جاتے ہیں۔ شاگرد سوال کرتا ہے، اُستاد جواب دیتا ہے اور اگر دین سچّا ہے تو اِن کے سوال اور جواب سے اُوپر سے علم آتا ہے۔ اگر جو (society) یا جو مجلس یا جو حلقہ ہے وہ بہت ہی اچھا ہے تو اُستاد تیاری کر کے آئے یا نہ آئے لیکن اُس کو یہاں بات کرتے کرتے اُس کو روپے میں سے آٹھ آنے کا یا چار آنے کا تازہ علم ملتا ہے، بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے یعنی تائیدی علم ملتا ہے۔ ابھی اُس کو کچھ باتیں یاد نہیں تھیں کہ بات کرتے کرتے ایک دم سے تائیدی قوّت سے وہ باتیں سمجھ میں آتی ہیں، اِس کو کہتے ہیں تائید اور بعض دفعہ بہت کچھ ہوتا ہے۔ جب آدمی کا دل صاف ہو، جب آدمی اِس قابل ہو کہ اُس کو تائید، آسمانی تائید، رُوحانیت کے آسمان کی مدد ملنی چاہئے تو اُس کو مل جاتی ہے۔ تو کس کی وجہ سے؟ یعنی شاگردوں کی وجہ سے۔ آپ کو بھی مشورہ ہے، آپ اگر اپنا علم بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ اِس تعلیم کو جاری رکھیں اور علم کو آگے بڑھائیں اور

آپ کے اچھے اچھے، بہت پاک اور پوِتر شاگرد ہوں کہ جن سے آپ کی پاکیزگی ہو جائے یعنی آپ کے علم میں نکھار پیدا ہو ،ایسے شاگرد ہوں کہ وہ آپ کی باتوں کو (accept) کریں۔ اِسی طرح آپ کو علم ملے گا اور آپ کی رُوحانی پاکیزگی ہو جائے گی لیکن پھر وہ آخر میں ایک ایسا شخص دین کے اندر کہ وہ نہ تو اُستاد ہے اور نہ شاگرد ہے تو پھر وہ محروم ہے دین کی وراثت سے، اُس کو کوئی وراثت نہیں ملے گی اور یہ کہ یا تو کسی کو دین کا مرد بن کر رہنا ہے یا کہ فیض لینے کے اعتبار سے دین کی عورت بننا، اور دوسری مثال اِسی کے ساتھ ساتھ جو اِس سے الگ نہیں ہے، کہ اگر حدود ہیں تو کوئی شخص اُوپر سے علم لیتا ہے اور اپنے ماتحت کو علم دیتا ہے تو اِس اعتبار سے اُس کی دو حیثیتیں ہیں، اُس کے دو مرتبے ہیں۔ ایک مرتبے میں وہ مرد ہے اور دُوسرے مرتبے میں دین کی عورت ہے، اُس کے پاس دو (positions) ہیں۔ یہ بھی بہت عمدہ بات ہے اور دین کے اندر سب سے مطلق اور سب سے کُلّی طور پر اور قطعی طور پر جو مرد ہے وہ عقلِ کُل ہے کہ اُس کے اُوپر کوئی حد نہیں ہے کہ وہ حد اُس کو علم دے اور جس کی وجہ سے وہ عورت کہلائے اور سب سے نچلے درجے میں جو قطعاً دین کی عورت ہے وہ مستجیب ہے، ایسا مُرید کہ ابھی وہ تعلیم نہیں دے سکتا ہے، تعلیم لے سکتا ہے، دے نہیں سکتا ہے، تو وہ دین کی ایک قطعاً عورت ہے، تو دین کے اندر ایک قطعاً مرد ہے اور ایک قطعاً عورت ہے، درمیان میں جو حدود ہیں نا وہ ایک اعتبار سے مرد ہیں اور دوسرے اعتبار سے عورت ہیں، اس کی کوئی بات نہیں ہے، یہ اچھی صفات ہیں اور وہ بھی بہت اعلیٰ صفت ہے جو قطعاً مرد ہے اور یہ بھی بہت اعلیٰ صفت ہے جو مستجیب ہے۔

دیکھیں کہ اِس ظاہری کائنات کو دیکھیں کہ زمین قطعاً زمین ہے اور نواں آسمان جو ہے وہ قطعاً آسمان ہے لیکن درمیان درمیان میں جو درجے ہیں تو اُوپر کے لحاظ سے زمین ہیں اور نیچے کو جو فیض دیتے ہیں اُس اعتبار سے آسمان ہیں۔ مثلاً ایک قطار ہے دس بارہ آدمیوں کا، تو کوئی چیز (pass) ہوتی ہے اور سب سے جو (top) پر جو آدمی بیٹھا ہے وہ کوئی چیز، قیمتی چیز (pass) کرتا ہے، وہی اپنی جیب میں سے، اپنے خزانے سے نکالتا ہے تو یہ چیز ایک دُوسرے کو دیتا ہے۔ کرتے کرتے آخر میں جا کر وہ چیز (stop) ہو جاتی ہے، اُس کے پاس دینے کے لئے کوئی [کچھ] نہیں ہے، تو دیکھا اِس میں تین باتیں ہوگئیں، ایک شروع میں جو چیز (start) ہوگئی اور ایک آخر میں جو چیز (stop) ہوگئی اور درمیان میں جو ہے اُنہوں نے ایک سے لیا، دوسرے کو دیا، تو تین (position) بنتی ہیں۔ دین کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ جو درمیانے حدود ہیں اُن کے پاس دو دو مرتبے ہے، جو اُوپر درجہ ہے، سب سے اُوپر اُس کے پاس ایک درجہ ہے، بہت بڑا ہے اور جو نیچے، سب سے نیچے ہے اُس کے پاس ایک درجہ ہے وہ لینے کا درجہ ہے، بس لیتا ہے کسی کو نہیں دیتا ہے، تو زکات میں بھی، علمی زکات [میں بھی] یہ حدود اُوپر سے زکات لیتے ہیں اور اپنے جو ماتحت ہیں اُن کو دیتے ہیں کہ اِس زکات کی مثال میں بھی تین (positions) ہیں، سب سے اُوپر جو (top) پر درجہ ہے وہ غنیٔ مطلق ہیں۔ وہ کسی سے زکات

لیتا نہیں ہے، وہ دینے ہی والا ہے اور درمیان والے جو ہیں ایک طرف سے لیتے ہیں تو دوسری طرف سے دیتے ہیں اور جو آخر میں ہے مستجیب وہ قطعاً فقیر ہے، کہ جس طرح شریعت میں، دین میں ہے کہ یعنی فقیر پر، درویش پر کوئی زکات نہیں ہے۔ وہ خود لیتا ہے تو علم کی زکات وہ کسی کو نہیں دے سکتا ہے لیکن جب وہ ماذون کے درجے میں اُبھرے گا تو اُس وقت وہ زکات دینے کے قابل ہو جائے گا۔ جیسے دُنیا کے اندر کوئی فقیر تھا، درویش تھا، اُس کے پاس کوئی مال و دولت نہیں تھی لیکن وہ امیر ہو گیا تو اب تو زکات دینے لگے گا، تو دین کی جو تاویل ہے اِس کائنات کے ساتھ بالکل (adjust) ہے اور اِس کائنات کے نظام کے موافق ہے اور بہت ہی عالیشان ہے کہ ایک بار سمجھ میں بات آ گئی تو دل خوش ہو جاتا ہے، اُس میں ذرا بھی شُبہہ باقی نہیں رہتا ہے، تو دیکھا آپ نے کہ اِنہوں نے جو سوال کیا اور اِس سوال سے کتنا فائدہ ہوا اور یہ بات بالکل ایسی ہوئی کہ یعنی ہم ہاتھ دھوتے ہیں تو دونوں ہاتھ ایک دوسرے کو دھوتے ہیں۔ شاگرد سے اُستاد کی رُوحانی پاکیزگی ہوتی ہے اور اُستاد سے شاگرد کو پاکیزگی ملتی ہے، اِن دونوں کے آپس میں پاکیزگی ہوتی ہے، تو یہ ہے۔ بہت شاندار بات ہے کہ دُنیا کے اندر ایسی مخلوق کہ وہ نہ نر ہے اور نہ مادہ، درمیان درمیان میں ہے تو وہ حقوقِ انسانی سے محروم ہے اور اُس کو نہ تو مرد کا حق ملتا ہے نہ عورت کا کیونکہ اسلام کے اندر کچھ حقوق ہیں تو مرد کے ہیں اور ہیں تو عورت کے ہیں اور درمیان درمیان کے کوئی خاص بات نہیں ہے، حقوق نہیں ہیں تاکہ جو دین میں جو تاویل ہے وہ صحیح ہو جائے۔ اُس کی خاطر سے یہ بظاہر ایسے لوگوں کو تھوڑی سی شاید ناانصافی بھی ہو سکتی ہے لیکن اِس کی وجہ یہ ہے کہ دین کے اندر انصاف ہو اِس کی خاطر سے یہ ظاہر میں، جسمانیت میں تکلیف ہوتی ہے کہ دونوں جگہ پر بات صحیح نہیں ہو سکتی ہے، یہ ہے اِن کے سوال کا جواب۔

علم میں آپ کو مضبوط ہو جانا، یہ علم جو آپ کو ملتا ہے، بہت اہم ہے، یہ شخص کی تعریف نہیں ہے، دین کی تعریف ہے اور بزرگانِ دین نے اپنی قیمتی عمروں کو صَرف کر کے تاویل کی کتابیں لکھی ہیں، بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ عربی میں ہیں، فارسی میں ہیں، دستیاب نہیں ہیں۔ دیکھیں کہ جب الموت پر حملہ ہوا، جب وہاں کی لائبریری ضائع کی گئی تو تاریخ میں کتنا افسوس کرتے ہیں تاریخ کے اعتبار سے اور علم کی اگر اہمیت نہ ہوتی تو آپ غور سے دیکھیں کہ امامِ زمین و زمان صلوات اللہ علیہ اپنے خزانوں میں سے کتنی دولت صَرف کرتے ہیں۔ کبھی بیٹھ کے آپ خود اِس کا تجزیہ کریں یا کسی سے پوچھیں کہ دُنیا میں امام کے کتنے علمی ادارے ہیں اور امام کے مُریدوں میں رُوحانی اور دینی علم کو عام کرنے کے لئے امام کتنا کچھ خرچ کرتے ہیں، اِس کا اندازہ کریں تو اِس سے علم کی اہمیت کا پتہ چلے گا آپ کو۔ علم کی اہمیت کا پتہ چلے گا اور پھر (production) کتنا ہوتا ہے، اُس کا بھی اندازہ کریں، مجھے کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ امامؑ کے منشاء کے مطابق (production) نہیں ہوتا ہے یا جتنا خرچ ہوتا ہے اُتنا (production) نہیں ہوتا ہے، علم کی فصل کیوں؟ اِس

لئے کہ شاید علم قیمتی ہے، گران ہے، مشکل ہے، اعلیٰ ہے اور اِس کے علاوہ بھی وجوہ ہوسکتی ہیں، ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ جہاں یہ بات ہے کہ علم کی اِس قدر اہمیت ہے آپ کو بہت آسانی سے اور بہت ہی سہولت کے ساتھ علم آپ کو ملتا ہے لیکن آپ اِس کو نظر انداز کرتے ہیں، اِس کو یاد نہیں کرتے ہیں، اِس کو عام بات سمجھتے ہیں تو معلوم نہیں شاید کل کو پوچھا جائے گا، کہاں؟ قیامت میں، کیوں؟ اِس لئے کہ آپ قرآن کو اُٹھا کر دیکھیں اور کسی قرآن کے جاننے والے سے پوچھیں کہ کیا قیامت کے دن خداوندِ عالم نعمتوں [کے بارے میں] پوچھے گا؟ نعمتوں کے بارے میں باز پُرس کرے گا کہ اُس نے انسانوں کو اور خصوصاً مومن کو جو جو نعمتیں دے رکھی تھیں تو مومن نے اُن کو کس طرح (use) کیا اور اُن سے کس طرح فائدہ اُٹھایا اور اُن نعمتوں کو کیا سمجھا؟ اِس کے بارے میں سوال ہوں گے، پیر پندیاتِ جوانمردی میں بھی یہ بات ہے، قرآن میں (direct) بات ہے۔ اِس کے لئے اگر آپ کو صاف ستھرا علم ملتا ہے جو اعلیٰ ہے، ایسا علم ملتا ہے کہ اُس کی ہر بات سَو باتوں کو جنم دے، دُنیا کے اندر کچھ ایسے درخت بھی ہیں کہ آپ باغ میں ایک درخت لگائیں تو اُس میں اتنی برکت ہے کہ سب باغ میں بس وہی درخت پیدا ہو جاتے۔ ایسے بیج بھی ہیں کہ وہ بیج آپ حاصل کریں نا! تو آپ کا جو باغ ہے وہ بالکل اُن پھولوں سے، اُن پودوں سے، اُن جھاڑوں سے ہرا بھرا ہو جائے گا، ایسے بیج بھی ہیں اور دُنیا میں ایسا کامیاب علم بھی ہے کہ اُس علم کو آپ لیں تو آپ کو بہت بلندی ملے گی۔ اِس لئے کہ وہ بہت (height) کی ہے، بہت بلندی کی ہے، تو آپ اُس علم کے ساتھ خود کو وابستہ کریں تو (automatically) آپ کو بہت (height) ملے گی، آپ کسی اُڑنے والی چیز کو (catch) کرتے ہیں تو آپ بلندی پر جاتے ہیں، ہے نا؟ تو اِس لئے میں تاکید کرتا ہوں کہ آپ علم کو بہت قدر دانی کے ساتھ ذخیرہ کریں۔

ایک وقت میں آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ کے پاس جو چیز جمع ہے اُس کی کیا قیمت ہے، اُس کی کیا قدر ہے اور میں کچھ نشانیاں بتاؤں گا کہ اِس علم کے رکھنے سے کیا ہوگا کسی سوسائٹی میں۔ ایک دن آپ کسی سوسائٹی میں ہوں گے، کچھ لوگ علم پر باتیں کرتے ہوں گے تو آپ کے پاس اگر علم ہے تو اُن کی باتیں بچگانہ لگیں گی، طفلانہ یعنی بچّوں کی سی باتیں لگیں گی اور کوئی علم کی باتیں کرتا ہے کہیں بھی، تو آپ کے پاس ایک معیار ہوگا، ایک کسوٹی ہوگی۔ اُس کسوٹی سے آپ یہ معلوم کرسکیں گے کہ وہ کس (standard) کی بات ہے۔ اچھا ہے کہ آپ خواہ مخواہ کسی کی باتوں میں نہیں آئیں گے، جو اچھی بات ہے تو اُس سے آپ کے علم کی تصدیق ہوگی، جو کمزور بات ہے تو آپ کو پتہ چلے گا تو پھر آپ سکون میں ہوں گے اور کہیں گے کہ دُنیا میں دُنیا والے کیسے ہیں، کس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور امامؑ کی کیا شان ہے، اسمٰعیلی مذہب کی کیا شان ہے کہ اِس کے اندر علم کی اتنی بلندی ہے، پھر آپ شکر گزار ہو جائیں گے۔ آپ کا دل شکر کرے گا، جو آپ خوش ہو جائیں گے تو یہ شکر ہوگا۔

اِس کے علاوہ جو پردے ہوتے ہیں وہ شکوک کے ہوتے ہیں یعنی امامؑ اور بندہ کے درمیان جو حجابات ہوتے ہیں، جو پردے ہوتے ہیں، جو دُوری ہوتی ہے، جو بُعد ہوتا ہے وہ جہالت و نادانی اور شکوک کے ہوتے ہیں، تو یہ علم ہی ایسا

ہے کہ اِس سے وہ پردے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں، شکوک دُور ہو جاتے ہیں اور جہالت کی تاریکی دُور ہو جاتی ہے علم کے نور سے اور مرضِ نادانی، نادانی کی جو بیماری ہے اُس سے شفا ہوتی ہے۔ پھر مومن کی رُوح کو نکھار ملتا ہے اور عبادت کامیاب ہوتی ہے، رُوحانی ترقّی کے لئے یہ مومن اُس کے بوجھ کو سہارنے کے قابل ہو جاتا ہے کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ امام کسی کو رُوحانی ترقّی اِس لئے نہیں دیتا ہے کہ وہ ایک یعنی بہت بھاری ذمّہ داری ہے اور بہت بڑا بوجھ ہے اور مومن علمی طور پر تیار نہیں ہے تو اِس واسطے خداوند کسی مومن کو خواہ مخواہ تکلیف نہیں دیتا ہے جب تک اُس میں مضبوطی نہیں آئی ہے، تو علم کی (exercise) سے یعنی اپنی رُوح کو پہلوان نہ بنائیں تو رُوحانیت کے بڑے بڑے دروازے نہیں کھلتے ہیں۔ اِس کے لئے علم کی سخت ضرورت ہے، علم کی سخت ضرورت ہے اور بہت ضرورت ہے اور علم کی ضرورت اِس لئے بھی ہے کہ اِس سے دفاع ہوتا ہے، (defence) ہوتا ہے اور دین ایک یعنی قلعے کی طرح ہے، ایک ملک کی طرح ہے، ایک (country) کی طرح ہے اور دیکھیں کسی (country) کا (defence) کس قدر اہم ہے کہ ملک کا جو (capital) ہے یا ملک کے اندر جو وسائل ہیں اُن میں سے بہت کچھ (defence) پر لگایا جاتا ہے ملک کے دفاع کے لئے، ملک کے (defence) کے لئے اور علم دفاع ہے، علم ہتھیار ہے، علم غذا بھی ہے، علم دَوا بھی ہے، علم روشنی بھی ہے، علم رُوح بھی ہے اور علم، علم کی حیثیّت میں خدا ہے، اور یہ دیدار کا ذکر جو قرآن میں موجود ہے، دیدارِ خدا تو کیا معلوم خدا کا دیدار علمی صورت میں ہو؟ یہ ہمیں ہمیشہ مادّیت میں محدود ہو کر نہیں سوچنا چاہیئے۔

امامؑ کے دیدار کے متعلق جب ہم سوچتے ہیں تو اُس میں ہمیشہ یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ جس طرح پنڈال میں امامؑ کا دیدار ہوتا ہے وہی محدود دیدار ہوتا ہے۔ کیا معلوم اُس کے پاس دیدار کے اور بھی طریقے ہوں گے، کیا معلوم امامؑ کی اور بھی حیثیتیں ہوں گی اِس جسمانی حیثیت کے علاوہ اِس پر مزید [سوچیں] کیا معلوم امامؑ ایک خوشبو بن کر آتا ہو اور اُس طرح بھی دیدار دیتا ہو اور یہ مومن علم کے نہ ہونے کی وجہ سے اِس کو نہیں سمجھتا ہو۔ دیکھیں ہمارا دل کتنا حسرت کرتا ہے دیدار کے لئے اور بہت دفعہ امامؑ دیدار دے چکا ہو گا لیکن ہم اُس کو نہیں سمجھتے ہیں۔ اِس میں امامؑ کا کیا قصور ہے؟ ہمارا قصور ہے کہ امام کو پہچانیں، امام کی حیثیتوں کو پہچانیں اور امامؑ کے دیداروں کو پہچانیں، امامؑ کی ملاقاتوں کو پہچانیں، یہی خوشبو جو ہے اِس میں محدود نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ ذکر میں امام کا دیدار ہو، ایک اچھا ذکر جس کے کرنے سے دل کو سکون ملتا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ اِس ذکر میں اُس نے ایک طرح سے دیدار کی ایک جھلک دی، ہوسکتا ہے کہ تصوّر میں ہو اور میرا تو یہ ایمان ہے کہ امام کا زیادہ سے زیادہ دیدار اُس چیز میں ہو گا جو چیز بہت ہی ضروری ہے، تو علم ضروری ہے۔ علم کی حیثیّت میں آپ کو دیدار دیتا ہو گا، جب کوئی آسمانی علم آپ کے ذہن میں اُترتا ہے تو اُس میں امامؑ کے دیدار کی ایک جھلک ہو سکتی ہے اور آپ اگر علمی طور پر اُس کو یاد کرتے ہیں، اُس کو پہچانتے ہیں تو یہ ایک مستقل دیدار بھی ہوسکتا ہے۔ آپ کی گریہ وزاری میں

اُس کا دیدار ہوسکتا ہے، آنسوؤں میں، بہتے ہوئے، برستے ہوئے آنسوؤں میں، گرم گرم آنسوؤں میں اُس کا دیدار ہوسکتا ہے اور آپ جب اُس کو یاد کرتے ہیں، اُس کی تسبیح پڑھتے ہیں، اُس کا نام جاری رکھتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ زبان پر اُس کا ظہور ہو، دل میں اُس کا ظہور ہو، آنکھوں میں ہو، آپ کی ہستی میں ہو، خواب میں ہو، خیال میں ہو، اچھے کاموں میں ہو۔ اچھے کاموں کے جو خیالات آپ پر مسلّط ہیں، اور ہمیشہ نیکی کے خیالات آپ میں ہیں، آپ اُن خیالات میں گھیرے ہوئے ہیں تو کیا یہ ایک قسم کا دیدار نہیں ہے؟ تو امام کا دیدار، امام کی ملاقات اِس طرح سے ہے، تو آپ جب دیدار چاہتے ہیں تو کون سا دیدار چاہتے ہیں؟ جسم کا دیدار یا نور کا دیدار؟ جسم کا دیدار تو جسم میں صحیح ہے۔ جسم کا دیدار نہ ہو تو نور کا دیدار کیسے؟ جسم کا دیدار وہی ہے جو آپ کو پنڈال میں ملتا ہے لیکن اِس کے علاوہ اُس کے نور کے دیدار کو بھی آپ چاہتے ہیں نا؟ تو پہلے آپ نور کی کیفیت کو دیکھیں۔

نور کے دیدار کو آپ چاہتے ہیں تو یک لخت چاہتے ہیں یا قسطوں میں چاہتے ہیں؟ یک لخت چاہتے ہیں تو آپ پر وہی حالت گزرے گی جو موسیٰؑ پر گزری۔ یک لخت یعنی کہ ایک ساتھ، یکا یک نور کا دیدار آپ چاہیں تو کیسے برداشت کریں گے آپ؟ آپ قسطوں میں چاہیں، ہوگئی بات، یعنی آپ قسطوں میں امامؑ کے دیدار کو چاہتے ہیں، آہستہ آہستہ چاہتے ہیں، درجہ بدرجہ چاہتے ہیں، اور (step-by-step) چاہتے ہیں، ٹھیک؟ اچھا تو پہلے اِس کے لئے آپ اُس کے نور کی شناخت کو حاصل کریں۔ نور کیسا ہے؟ کس رنگ میں ہے؟ کس کیفیت میں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اِس کے لئے آپ علم کی مدد سے نور کی شناخت حاصل کریں اور پھر آپ کو نور کی شناخت ہوتی ہے تو پھر اِس تیاری سے آپ آگے بڑھیں، کتابیں پڑھیں، مضامین پڑھیں، لیکچرز کو سُنیں نور کے بارے میں، نور کی شناخت ضرور کریں۔ اگر آپ کو یہ لگتا ہے کہ نور علمی شکل میں ہے، مادّی شکل میں نہیں ہے، اگر مادّی شکل میں ہے تو سورج کی طرح ہے، چاند کی طرح ہے اور ستاروں کی طرح ہے، بجلی کی طرح ہے، گیس کی طرح ہے، تو ٹھیک ہے یہ بھی روشنی ہے اور آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لئے کافی ہے لیکن ایسا نہیں ہے، علمی طور پر ہے، عقلی طور پر ہے، عرفانی طور پر ہے، حکمت کے رنگ میں ہے، تو پھر آپ زیادہ سے زیادہ علم کو، حکمت کو حاصل کریں تاکہ اِس کی بدولت آپ اُس ذاتی دیدار سے قریب تر ہو جائیں اور تازہ ترین دیدار سے آپ یعنی ذاتی طور پر اور امامؑ سے، امامؑ کے وسیلے سے، امامؑ کے توسط سے سب کچھ پائیں، سب کچھ سُنیں، سب کچھ دیکھیں۔

اِس کے لئے امامؑ کے اِس بکھرے ہوئے نور کو سمیٹیں، امام کا بکھرا ہوا نور کیا ہے؟ دین کا علم ہے۔ فرامین اِقدس میں، گنانوں میں، کتابوں میں یہ جو حقیقت کی باتیں ہیں یہ سب امام کا بکھرا ہوا نور ہے۔ سورج کے اندر دو قسم کا نور ہوتا ہے ایک وہ سرچشمے کے اندر نور ہے جو سمٹا ہوا ہے اور دُوسرا بکھرا ہوا نور ہوتا ہے، تو بکھرے ہوئے نور سے دُنیا قائم ہے، دُنیا کی آبادی نا؟ تو پہلے بکھرے ہوئے نور کو سمیٹیں، اُس سے خود کو آباد کریں، اُس کو لیں۔ پھر اِس سے مضبوطی حاصل ہو تو سورج کے سرچشمے کے اندر جو نور ہے اُس کو ہم دیکھیں گے مگر پھر میں کہتا ہوں کہ سورج کے سرچشمے کے اندر جو نور ہے اُس میں

طوفان ہے، زیادہ دیر تک آپ اُس کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ دھوپ کو دیکھ سکیں گے اور مکان کے اندر دن کے وقت جو روشنی آتی ہے اُس کو دیکھ سکیں گے لیکن آنکھ اُٹھا کر سورج کی طرف دیکھیں تو آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی، پھر کیا کر سکیں گے؟ آپ آنکھوں سے جائیں گے، دُنیا تاریک ہو جائے گی۔ اِس کے لئے آپ نور کی تلاش میں ہیں تو ترتیب سے علم کی مدد سے، علم کی روشنی میں نور کو سمیٹیں، وہ بکھرا ہوا نور ہے، اگر نور علم نہیں ہے، حکمت نہیں ہے، معرفت نہیں ہے، کسی اور رنگ میں ہے تو پھر وہ بات الگ ہے لیکن میں کہتا ہوں آپ بھی شاید مانتے ہیں بلکہ یقیناً مانتے ہیں کہ نور، امامؑ کا نور علمی شکل میں ہے۔ اگر کسی کو امامؑ نے رُوحانی ترقّی میں علم نہیں دیا تو سمجھ لینا کہ اُس نے بڑے دیدار کو دریغ رکھا اُس مومن سے۔ آج بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنہوں نے امام کا دیدار کیا، اچھا ہے، وہ تھوڑی سی ابتدائی قسم کی روشنی کو دیکھتے ہیں تو اُس کو امام کا دیدار سمجھتے ہیں، امامؑ کا نور سمجھتے ہیں، اچھا ہے یہ بھی ایک بچّے کو مٹھائی دے کے اُس کو منانے کی طرح ہے، وہ بُری بات نہیں ہے، اُن کو آگے بڑھانے کے لئے ہے، تو خداوند کی حکمت ایسی ہے، آپ نے کبھی دیہاتوں کی سیّاحت نہیں کی ہے۔ کوئی شخص اُس کے پاس کوئی (kid) ہے، یعنی بکری کا بچّہ یا بھیڑ کا بچّہ تو وہ کیا کرتا ہے؟ یا کوئی اور حیوان ہے تو کیا کرتا ہے؟ درخت کے کچھ پتّے درخت کی ایک ڈالی کو توڑ کر ہاتھ میں لیتا ہے، اُس کو ہلاتا ہے، ہلاتا ہے تو وہ حیوان اُس کو دیکھتا ہے۔ پتّوں کی طمع سے اُس کے پیچھے پیچھے پیچھے چلتا ہے، تو یہ اِس وسیلے سے یہ انسان اُس بکری کے بچّے کو کسی آرام کی جگہ پر یا جہاں اُس کی رہائش ہے اُس تک لے جانے کے لئے یا باغ تک لے جانے کے لئے اِس سے کام لیتا ہے۔ اِس طرح رُوحانیت کی ابتدائی منزلوں میں جو چیز ملے گی اُس کی مثال ایسی ہو گی۔

آگے جو ہے، آگے چل کر آپ کو علم کا دیدار ملے گا تو نور ملے گا۔ نور کا رنگ، اصلی رنگ وہی ہے اور پھر آپ کو اُس میں دیدار ملے گا، ہمارے پیروں کو، بزرگوں کو خداوند نے دیدار دیا تھا، کس رنگ میں دیدار دیا تھا؟ علم کے رنگ میں دیدار دیا تھا۔ اُنہوں نے اِس نور سے کام لے کر دُنیا کے اندر تبلیغ کی، بہت سے لوگوں کو ہلاکت سے بچایا، بہت سے نفوس کو بہشت تک پہنچایا۔ آج اُن نفوس کی نسل دُنیا میں قائم ہے، اتنے سارے اسمٰعیلی ہیں، تو یہ یعنی حضرت عیسیٰؑ کے معجزے سے بڑھ کر ہے اور حضرتِ عیسیٰؑ کے اُس روایتی معجزے سے، اُس کی میں بات کرتا ہوں مثلاً کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے سَو برس کا ایک مرا ہوا شخص زندہ کیا تو پھر حضرتِ عیسیٰؑ کے زمانے سے اب تک کتنا وقت گزر گیا، وہ شخص زندہ ہے جس کو عیسیٰؑ نے زندگی بخشی تھی؟ میں انکار نہیں کرتا ہوں، تو یہ ایک روایتی معجزہ ہے۔ اِس روایتی معجزے سے یہ معجزہ جو ہمارے پیروں نے کیا، بڑھ کر ہے کہ اُنہوں نے بہت سے نفوس کو ہلاکت کی موت سے بچایا، نہ صرف اُن کو بچایا بلکہ اُن کی نسل سے کروڑوں انسان دُنیا میں مومن ہوئے اور بہشت میں چلے گئے تو یہ کس چیز کی بدولت؟ اُس چیز کی بدولت کہ امامؑ نے اُن کو علمی دیدار دیا تھا، نور دیا تھا۔ کیا یہ دیدار اچھا ہے کہ آپ نے امامؑ کے چہرے کو دیکھا اور شکر گزار ہو گئے اور پھر واپس آ گئے۔

اُس سے آپ کیا(catch) کرسکیں گے؟ کیا یہ دیدار اچھا نہیں ہے کہ امام کا دیدار ہو اور ایسا دیدار ہو کہ اِس دیدار کے ساتھ امامؑ کے نور سے آپ پر کرنیں برسیں، چنگاریاں برسیں۔ پھر آپ کے وُجود کے اندر امامؑ کے نور سے نور بھرے اور پھر وہ یہ آپ کے اندر مستقل رہے تا کہ آپ اِس سے کام لیں اور کام مقصود ہوتا ہے، شغل مقصود نہیں ہے، وقت گزرنا مقصود نہیں ہے، تفریح مقصود نہیں ہے۔ ایک تو معرفت مقصود ہے، ایک تو کام مقصود ہے، کام اگر مقصود ہے تو امامؑ ایسا دیدار دے کہ اُس دیدار سے آپ کے اُوپر کچھ برسے، آپ کی ہستی میں تبدیلی آئے، آپ کے وُجود میں نور بھرے اور پھر اُس نور سے آپ کام کریں تو ہمارے پیروں کے لئے ایسا ہی کیا۔ اُن کے وُجودِ خاکی کو وُجودِ نورانی بنایا، اُن کے وُجود میں نور تھا، یہ نور ایسا نہیں تھا کہ یہ مٹّی میں اُن کے جسم کے ساتھ دفن ہو جائے، یہ نور زندہ تھا، آج یہ نور مُریدوں کے دل میں زندہ ہے، گنانوں کی شکل میں زندہ ہے، علم کی صورت میں زندہ ہے، عقیدہ، محبّت اور دینداری، مُریدی اور مومن کے دیگر اوصاف کی صورت میں وہ نور زندہ ہے، تو نور کو زندہ رہنا ہے اِس لئے آپ نے سمجھ لیا کہ علم کیا ہے۔ یہ سب علم کی تعریف ہے، علم امام کا نور ہے تو آپ علم کو ہر قیمت پر قبول کریں اور چھان بین کریں کہ آپ کے اندر کیا ہے؟ آپ کے اندر اچھی باتیں ہیں تو کوئی بات نہیں ہے اُن اچھی باتوں کی تصدیق ہوگی، (confirmation) ہو جائے گا اور آپ کے اندر کوئی ایسی بات ہے، گو کہ وہ بات دین سے آپ کو ملی ہے لیکن کیا معلوم آپ کو ابتدائی تعلیم دینے کی وجہ سے ایسی بات دی گئی ہو اور آپ نے اُس کو (accept) کیا ہے اور سینے سے لگا کر رکھا ہے حالانکہ وہ بات ہے صحیح لیکن وہ پچھلے (step) کی ہے۔

اسلام نے سیڑھی کا تصوّر دیا (۷۰:۳)۔ اسلام کے اندر معراج کا قصّہ بہت ہی مشہور ہے اور معراج کی اہمیت بہت بڑی ہے، تو معراج کے لُغوی معنی کیا ہیں؟ سیڑھی اور سیڑھی کو زمانۂ قدیم میں کس طرح بناتے تھے؟ سیڑھی، وہ سیڑھی لکڑی کی ہوتی تھی، لوہے کی بھی ہوسکتی ہے یا یہ کہ اِس سیڑھی سے یعنی آپ (up stairs)، اور (down stairs) مُراد لیں۔ بہرحال اِس کا خلاصہ (stages) ہیں، درجے ہیں۔ اسلام کے اندر درجے ہیں، اسلام کے اندر جب درجے ہیں تو وحی ہو یا دیدار ہو یا تعلیم ہو تو وہ یعنی کہ (stage wise) ہوتا ہے۔ جب (stage wise) ہوتا ہے تو آپ بھی (stage) سے گزر رہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کے اندر بہت سی باتیں ایسی ہوں کہ اگلے (step) میں آپ کو بتائی گئی تھیں۔ اِس لئے یہ دین کی بے حرمتی نہیں ہے کہ آپ ایک بات کو چھوڑیں اور دُوسری بات کو قبول کریں، رُوحانی ترقّی نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک مومن ہے، اُس نے اگلی باتوں کو نہیں چھوڑا۔ یہ بات ایسی ہے دُنیاوی لحاظ سے کہ کوئی شخص (primary) میں تھا تو وہ (middle) میں جاتے ہوئے وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے اگلے اُستاد نے یہ بات بتائی تھی، کتنی نادانی ہوگی حالانکہ سب اُستادوں کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دین کی ساری تعلیمات کا مقصد ایک ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اُن کو آگے بڑھانا ہے، ہوسکتا ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوں کہ وہ اگلے (stages) پر تھیں تو اِس (stage) پر اُن کو چھوڑنا

چاہیئے۔ بہرحال علم کی اہمیّت کی یہ بات ہے اور بات سے بات نکلی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں بہت ہی ضروری ہیں اور مفید ہیں۔ مولا آپ کو سلامت رکھے اور ترقّی دے، علم کی بلندی عطا کرے۔ (آمین)

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: ثناوزیر علی　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پُروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: قرآن میں اندھاپن کا ذکر

کیسٹ نمبر: ۶۵   تاریخ: فروری، ۱۹۸۲ء کراچی

جیسا کہ آپ جانتے ہیں عزیزانِ من! قرآنِ پاک میں بہت سے اعلیٰ سے اعلیٰ موضوعات ہیں۔ چنانچہ آج ہم اندھاپن کے موضوع پر کچھ بات چیت کرنا چاہتے ہیں کیونکہ خداوندِ عالم نے قرآن میں کچھ اندھاپن کا ذکر فرمایا ہے تو ہم اُس کی توفیق سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ اندھاپن کیا ہے۔ کیا یہ ظاہری ہے، باطنی ہے، جسمانی ہے یا رُوحانی ہے؟ اور کس چیز کے نہ دیکھنے سے اندھاپن ہوجاتا ہے؟ یا کس چیز کے نہ دیکھنے سے اندھا کہا جاتا ہے؟ اُس کے بارے میں ہم کچھ آیات کی روشنی میں بات کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہم کو ایک آیۂ مبارکہ ملتی ہے اور اُس کا ارشاد اِس طرح سے ہے کہ:۔

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○مَثَلُ الۡفَرِیۡقَیۡنِ کَالۡاَعۡمٰی وَالۡاَصَمِّ وَالۡبَصِیۡرِ وَالسَّمِیۡعِ ؕ ہَلۡ یَسۡتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ" (۱۱:۲۴)۔ دو گروہوں کی مثال، دو فرقوں کی مثال یعنی ایک فرقہ حق پر ہے اور دوسرا فرقہ باطل پر ہے، تو اِن کی مثال کیا ہے؟ وہ مثال یوں ہے کہ ایک تو ہے اندھا اور ساتھ ہی بہرا بھی اور دُوسرا ہے دیکھنے والا اور سننے والا تو کیا ایسے میں دونوں فرقے برابر ہوسکتے ہیں؟ ایک فرقہ ہے اندھا اور بہرا اور دُوسرا فرقہ ہے دیکھنے والا اور سننے والا، تو خدا پوچھتا ہے کہ کیا دونوں ایک جیسے ہیں، تو تم کیوں غور نہیں کرتے ہو؟ دونوں ایک جیسے نہیں ہوسکتے ہیں کیونکہ ایک تو ہے اندھا اور بہرا اور دُوسرا ہے دیکھنے والا اور سننے والا۔ یہاں پر سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اِس دُنیا کے اندر کوئی ایسی چیز بھی ہے، کوئی ایسی حقیقت بھی ہے کہ اُس کو کچھ لوگ تو دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ نہیں دیکھتے ہیں، مگر ایسی چیز کیا ہوسکتی ہے جس کو بعض لوگ دیکھیں اور بعض لوگ نہ دیکھیں؟ کیا یہ کوئی مادّی چیز ہوسکتی ہے؟ دُنیا کی کوئی چیز، دُنیا کی کسی چیز کے دیکھنے میں سب لوگ یکساں ہیں، اُن میں ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ ہاں! یہ بات ہوسکتی ہے کہ یہ کوئی دینی چیز ہے، دینی چیز بھی ظاہری طور پر جو کچھ ہے اُس کو سب دیکھتے ہیں اور البتہ اُس چیز کے اندر کوئی حیثیّت ہے یا اُس کا کوئی مرتبہ ہے جس کے جاننے میں اور سمجھنے میں لوگ یکساں نہیں ہیں۔ سب سے پہلے قرآن کی مثال کیوں نہ لیں، قرآن جو آپ کے سامنے ہے، اِس کو تو کافر بھی دیکھتا ہے اور مومن بھی دیکھتا ہے، مادّی لحاظ سے، ظاہری طور پر لیکن قرآن کی ایک خاص حیثیّت ہے جس کو صرف مومن دیکھ سکتا ہے اور کافر اُس کو نہیں دیکھتا ہے۔ اب کافر اِس معاملے میں اندھا ہے اور مومن

ایسا نہیں ہے، مومن تو بینا ہے، اُس کی آنکھ ہے، وہ دیکھتا ہے بالکل اِسی طرح سے مومن قرآن سے جو کچھ سنتا ہے کافر وہ نہیں سنتا ہے۔ چنانچہ قرآن کے سلسلے میں مومن کو جو کان ملا ہے وہ کافر کو نہیں ملا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ کافر نے خود از خود ایسے کان سے ناشکری کی ہے اور مومن نے ایسے کان کو خدا کی توفیق سے حاصل کیا۔ اب قرآن کے بعد امام کو لیجئے کہ امام ہی وہ ہستی ہے جس کے مرتبے کو کچھ لوگ دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ اُس کے دیکھنے سے اندھے ہیں اور جو اندھے ہیں وہ بہرے بھی ہیں اور جو دیکھتے ہیں وہ سنتے بھی ہیں۔ امام کی حیثیّت کے متعلّق جو لوگ سنتے ہیں وہ دیکھتے بھی ہیں اور جو دیکھتے ہیں وہ سنتے بھی ہیں تو اندھا پنے کی ایک بات یہ ہوئی۔

خداوندِ عالم کا پاک ارشاد ہے: ''قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّوۡرُ'' (۱۳:۱۶)۔ خداوندِ عالم اپنے حبیب سے فرماتا ہے یعنی رسولِ پاک سے صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے فرماتا ہے کہ آپ کہئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا ایک جیسے ہو سکتے ہیں یا تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہو سکتی ہیں؟ تو یہاں وہی مطلب دُہرایا گیا ہے اور اِس میں تاریکی اور روشنی دونوں کا ایک ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے۔ تاریکی کا مطلب جہالت و نادانی اور گمراہی ہے اور نور کے معنی ہدایت اور علم و حکمت ہے تو خدا کی طرف سے نور کا ہونا، نورِ ہدایت کا ہونا لازمی بات ہے۔ خدا کے جیسے نام ہیں، خدا کی جیسی صفات ہیں اُن کے پیشِ نظر اِس دُنیا کے اندر نورِ ہدایت کا ہونا ایک حقیقت ہے لیکن بعض انسان جس طرح اِس نورِ ہدایت سے انکار کرتے ہیں اور اِس انکار کے نتیجے میں تاریکی کی جو کیفیت اُن پر گزرتی ہے وہی ظلمت ہے، وہی تاریکی ہے، نہیں تو خدا نے اہتمام سے کچھ تاریکی پیدا نہیں کی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان خود پیدا کرتا ہے، تو تاریکی کا مطلب گمراہی ہے، تاریکی کا مطلب جہالت و نادانی ہے اور روشنی کا مطلب نورِ ہدایت ہے، علم ہے، حکمت ہے۔ اِس کا مطلب دُوسرے الفاظ میں یوں ہے کہ نور امام ہے اور ظلمت و تاریکی اُس کے مخالف ہیں۔ رسولِ برحقؐ کے جانشین کی ہدایات کے خلاف لوگ جو باتیں کر کے دین میں تاریکی پیدا کرتے ہیں وہ ظلمت ہے، وہ تاریکی ہے، تو یہ دونوں کیفیتیں برابر نہیں ہیں اور اندھا اور بینا یعنی نابینا اور دیکھنے والا ایک جیسے نہیں ہیں۔

یہاں پر ایک کُلّیہ جیسی آیت ہے، اِس کو توجّہ سے سننے کی ضرورت ہے اور اِس کی بہت کچھ تشریح کی جا سکتی ہے بلکہ اِس کا جو مفہوم ہے وہ آپ کو ہمیشہ یاد رہے۔ عربی الفاظ اگرچہ آپ کو یاد نہیں ہوتے ہیں لیکن اِس کا مفہوم آپ کو یاد ہونا چاہئے اور کم سے کم اِس کے ساتھ ریفرینس بھی یاد ہو۔ یہ ہے ۱۷:۷۲ یعنی سورۂ بنی اسرائیل کے ۷۲ نمبر کی آیت ہے اور وہ ارشاد یوں ہے: ''وَمَنۡ كَانَ فِيۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِي الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى وَاَضَلُّ سَبِيۡلًا'' (۱۷:۷۲) اور جو اِس حیاتِ دُنیاوی میں اندھا ہے تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا اور وہ بہت دُور کا گمراہ ہوگا، بہت دُور کا، یہ اِس آیۂ مبارکہ کا مختصر ترجمہ ہے۔ اب آپ توجّہ دیں کہ میں اِس کی کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا کسی کو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ

اندھاپن ظاہری آنکھ سے متعلّق ہے؟ نہیں! اگر کوئی بندۂ خدا ظاہری آنکھ سے اندھا ہو تو خدا اُس پر طنز نہیں کرتا ہے، خدا ایسے اندھے کی مذّمت کیوں کرے؟ لیکن وہ طنز کرتا ہے ایسے اندھاپن پر جو کوئی انسان خود اپنے اختیار سے اپنے آپ میں پیدا کرتا ہے، تو وہ کون سی چیز ہے کہ جس کے دیکھنے سے بعض لوگ اِس دُنیا میں اندھے ہیں؟ درحالیکہ دُوسرے لوگ اُس کو اِس دنیا میں دیکھتے ہیں تو قیامت کے دن بھی اُس کو دیکھیں گے۔ عجیب بات ہوگی کہ جو لوگ اِس دُنیا میں اندھے ہیں تو وہ قیامت کے دن بھی اندھے اُٹھائے جائیں گے یعنی اُن کا حشر اندھے پنے میں ہوگا، پھر قیامت کی کوئی چیز وہ دیکھ نہیں پائیں گے۔ بہشت کا دیکھنا تو درکنار کسی بات کو بھی نہیں سمجھیں گے، کسی بات کو بھی نہیں دیکھیں گے اور قیامت کے سارے احوال اُن پر اندھے پنے میں گزریں گے، ہمارے بزرگانِ دین نے ائمّۂ طاہرین کی مقدّس روایات کی روشنی میں اِس کی تشریح یوں کی ہے کہ دُنیا میں اندھے وہ لوگ ہیں جو امام کو، اُس کے مرتبے کو، اُس کی حیثیّت کو نہیں دیکھتے ہیں اور اِس کی وجہ سے قیامت کے دن وہ اندھے ہی اُٹھائے جائیں گے یعنی اُن کا حشر اندھے پنے میں ہوگا اور یہاں گمراہی کا بھی ذکر ہے کہ ایسے لوگ جو دُنیا میں اندھے تھے کہ اُنہوں نے حق کو اور نورِ خدا کو نہیں دیکھا، نہیں سمجھا، نہیں پہچانا اور وہ قیامت میں بھی اندھے ہی رہیں گے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت دُور کے گمراہ تھے، بہت دُور کے گمراہ تھے۔ ایک گمراہی یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی شخص راہِ راست سے ایک قدم یا دو قدم بھٹک جائے، امکان ہے کہ وہ نزدیک ہونے کے باعث چکّر کھانے میں، اِدھر اُدھر دیکھنے میں پھر سے راہ کو پا سکے یعنی اپنے ماحول اور قُرب و جوار کے آثار سے راہِ راست کو پائیں کسی علامت سے، کسی نشانی سے لیکن جو لوگ اِس گمراہی میں بہت دُور جا نکلتے ہیں تو اُن کو راہِ راست دوبارہ نہیں مل سکتا بلکہ قطعاً نہیں مل سکتا۔ اِس لئے قرآن میں جہاں کہیں دُور کی گمراہی کا ذکر ہے تو بہت ہی انتہائی گمراہی مقصود ہوتی ہے یعنی ایسے لوگوں کے لئے پھر سے ہدایت کے ملنے کا امکان نہیں ہوتا ہے، تو دُور کی گمراہی کا مطلب یا کہ دُور کی گمراہی کی تشریح یہ ہے۔ آپ سنتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ اِس آیت کے اندر کچھ ایسے لوگوں کا ذکر ہے کہ وہ دُنیا میں اندھے تھے اور پھر قیامت میں بھی اندھے ہی رہیں گے اور اِس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گمراہ تھے یعنی دین کے معاملے میں وہ گمراہ تھے، بھٹک گئے تھے۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ جو ہدایت پر ہوتے ہیں اُن کو وہ بصیرت ملتی ہے، اُن کو وہ آنکھ ملتی ہے جس سے اُس چیز کو دیکھ سکتے ہیں جس کو کہ دیکھنا چاہئے، جس کو کہ دیکھنے سے بصیرت ملتی ہے، جس کو کہ دیکھنے سے دل کی آنکھ ملتی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ظاہری اندھاپن نہیں ہے، یہ رُوح کا اندھاپن ہے، رُوح کی آنکھ کی بات ہے، دل کی آنکھ کی بات ہے۔

یہاں پر ارشاد ہے: ''اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِہَا ۟ فَاِنَّہَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَلٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ'' (۲۲:۴۶) بہت ہی شاندار ارشاد ہے۔ کیا یہ لوگ رُوئے زمین پر چلے پھرے نہیں تا کہ اِن کے ایسے دل ہوتے جن سے حق باتوں کو سمجھتے یا اِن کے ایسے کان ہوتے جن

کے ذریعے سے سچّی باتوں کو سنتے کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتی بلکہ جو دل سینے میں ہیں وہ اندھے ہوجایا کرتے ہیں۔ یہاں پر آکر مطلب صاف ظاہر ہوگیا کہ یہ ظاہری آنکھوں کی بات نہیں ہے بلکہ اصل بات دل کی آنکھ کی ہے، دل ہی اندھے ہوتے ہیں، دل ہی اندھے ہوتے ہیں۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ دُنیا میں جو حقیقت ہے اور جو حقیقت خدا کے پیشِ نظر ہے اور جس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا فرماتا ہے کہ فلاں لوگ اندھے ہیں تو وہ حقیقت ایسی نہیں ہے کہ اُس کو ظاہری آنکھوں سے سمجھ لیا جائے۔ اُس کے سمجھنے کے لئے، اُس کی پہچان کے لئے دل کی آنکھ چاہئے، وہ نہ ہو تو ظاہری آنکھ کچھ کام نہیں کرسکتی ہے، تو بہت سے لوگوں نے ظاہری آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے نہیں سوچا کہ ظاہری آنکھ کافی نہیں ہے اور جس کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ اندھے ہوگئے۔ صاف بات ہے کہ اگر دل کی آنکھ ہے اور دل کی آنکھ کی اہمیّت ہے اور دل کی آنکھ کو روشن ہونا چاہئے تو دین کے اندر باطن کی، حکمت کی، تاویل کی اہمیّت ہے یعنی یوں سمجھنا چاہئے کہ دین کے اندر ظاہر میں کوئی پتہ نہیں چلتا ہے اور اگر ہم ظاہر ہی ظاہر پر اکتفا کریں، اُسی پر قناعت کریں، اُسی پر بس کریں تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکے گی اور امامؑ کی شناخت کے بارے میں بھی دل کی آنکھ چاہئے۔ دل کی آنکھ کی مدد ہو تو صحیح ہے، مطلب اِس کا یہ ہوا کہ خداوندِ عالم باطن کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ظاہر سے باطن کی طرف دعوت دیتا ہے، باطن کی طرف بلاتا ہے، توجّہ دلاتا ہے کہ دین میں، اسلام میں باطن کی بہت بڑی اہمیّت ہے اور یہ صورتِ حال امامؑ پر منطبق ہوجاتی ہے کہ امامؑ ہی ایسی ہستی ہے کہ اُس کی وجہ سے لوگ دو فرقوں میں ہوگئے ہیں۔ قرآن کے معاملے میں کسی بھی مسلمان کو کیا شک ہوسکتا ہے، اسلام کے بارے میں کسی بھی مسلمان کو کیا شک ہوسکتا ہے۔ سب کہتے ہیں اسلام برحق ہے، سب کہتے ہیں قرآن برحق ہے، اِس میں تو سب مسلمان ایک ہیں لیکن امامؑ کی ہستی، امامؑ کی شخصیّت ہی ایک ایسا امتحان ہے، ایک ایسی آزمائش ہے کہ اُس سے آگے بڑھنا بہت بڑی مشکل ہے، بہت بڑی مشکل ہے۔ لہٰذا امام پر آکر لوگ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اور دو گروہوں کا ذکر آگے کسی آیت میں گزر گیا اور گمراہی کے اشارے سے بھی آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جو لوگ امامؑ کے مقدّس دامن سے وابستہ ہیں وہ گمراہ نہیں ہیں کیونکہ آنحضرتؐ کے بعد ہادیٔ برحق وہی ہیں، نورِ خدا وہی ہیں، روشنی وہی ہیں، نور وہی ہیں، ہدایت کا سرچشمہ وہی ہیں۔

اِس آیت کے ساتھ ایک حدیث کی طرف میں اشارہ کرتا ہوں، گو کہ وہ حدیث کئی دفعہ آپ کے سامنے سُنائی گئی ہے۔ تاہم ایک بار پھر اِس مناسبت سے چونکہ یہاں اِس آیت کے ساتھ ایک حدیث بھی چاہئے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ: ''مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً وَ الْجَاهِلُ فِی النَّارِ'' انسان کو مرتے دم تک مہلت دی گئی ہے، چنانچہ جو شخص مرتے دم تک امامؑ سے بیگانہ رہے اور امام کو نہ پہچانے اور مرجائے تو اُس کی موت، اُس کی اصل موت جسمانی نہیں بلکہ رُوحانی موت ہوتی ہے، وہ جہالت و نادانی کی موت ہوگی اور جاہل و نادان کا ٹھکانا کہاں ہے؟ دوزخ

ہے، یہ اِس حدیث کا مختصر ترجمہ ہے۔ اب یہاں اِس حدیث کا تھوڑا سا فلسفہ سنئے کہ جو شخص امام کو پہچانے بغیر مرے تو وہ جاہل مرتا ہے، نادان مرتا ہے، اُس کو علم نصیب نہیں ہوتا ہے۔ پس اِس سے ظاہر ہے کہ علم جس کو صحیح معنوں میں دین کے مفہوم میں علم کہنا چاہئے وہ امام سے وابستہ ہے یعنی علم کی کلید کہئے یا علم کا دروازہ کہئے یا علم کا خزانہ کہئے، علم کا سرچشمہ کہئے وہ امام ہے۔ جو امامؑ کے لئے اقرار کرتا ہے وہ اگر اَن پڑھ بھی ہو، نادان بھی ہو لیکن اُس نے سب سے بنیادی دانائی اور دانشمندی کا کام یہ کیا کہ خود کو دانشمند اور دانائی سے وابستہ کیا، گو کہ یہ دانائی ظاہر نہیں ہے لیکن اِس سے بڑھ کر اور کیا دانائی ہوسکتی ہے کہ اُس نے خدا کی توفیق سے خود کو دانا کے دامن سے وابستہ کیا، خود کو دانا کے سپرد کر دیا یعنی اُس شخص نے جس نے امام کی امامت کے لئے اقرار کیا تو اب ایسا شخص آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں اور دُنیا میں نہیں تو قیامت میں وہ دانا ہو جائے گا۔ وہ علم ہی علم ہو جائے گا، وہ سراپا علم کا سرچشمہ بن جائے گا کیونکہ اِس نے بہت دانشمندی کی کہ خود کو امامؑ سے وابستہ کیا، تو یہ مفہوم کہاں سے ملا؟ یہاں سے ملا اِس حدیث سے ملا اور رسولؐ نے فرمایا کہ جو امام کو نہیں پہچانتا ہے تو وہ جاہل ہو جاتا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جو امامؑ کے لئے اقرار کرتا ہے وہ عاقل اور دانا بن جاتا ہے، تو اِس کا نتیجہ یعنی عکس یہ کہ مقابلے میں جو شخص امام کو نہ پہچاننے کے نتیجے میں جاہل اور نادان مرتا ہے اور دوزخ میں چلا جاتا ہے تو اِس کے مقابلے میں جو شخص امام کے لئے اقرار کرتا ہے تو وہ عاقل و دانا ہو جاتا ہے اور وہ بہشت میں چلا جاتا ہے، یہ ہے نتیجہ تو یعنی اِس آیت کا اِس حدیث سے ربط ہے کہ الفاظ مختلف ہیں مگر مطلب ایک ہے۔

اندھا کا مطلب ہے علم کا نہ ہونا اور بصیرت والا، آنکھ والا سے مُراد ہے ایسا شخص جو علم رکھتا ہے۔ کون سا علم؟ دین کا علم، امام کی پہچان کا علم یعنی جو امام کو پہچانتا ہے یا امام کے لئے اقرار کرتا ہے، خود کو امام سے وابستہ کرتا ہے تو یہ بھی علم ہے۔ بہت بڑی دُور اندیشی ہے اور ایسی دُور اندیشی ہے کہ اِس کے مقابلے میں کوئی دُنیا کی دُور اندیشی ٹھہر نہیں سکتی ہے، یہ ایسی اہم بنیادی اور بہت ہی اعلیٰ دُور اندیشی ہے یعنی دُور کو سوچنا، دُور جو ہے وہ قیامت ہے۔ جو قیامت کو سوچتا ہے اور قیامت کے لئے سوچتا ہے وہ بڑا دُور اندیش ہے، تو جو آج کے مقابلے میں کل کو سوچتا ہے وہ دانا ہے۔ چنانچہ امام کے لئے اقرار کرنا اور خود کو امام کے مقدّس دامن سے وابستہ کرنا یہ بہت بڑی دانشمندی ہے اور یہ علم کی بنیاد ہے، یہیں سے علم شروع ہو جاتا ہے اور یہیں سے رُوحانیت کا دروازہ کھل جاتا ہے، علم کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ بہت بڑی دانائی ہے کہ خود کو دانا سے وابستہ کریں تاکہ انسان میں جو علم کی کمی ہے، تاکہ انسان میں جو جہالت ہے، جو جہالت کی تاریکی ہے وہ اِس نورِ ہدایت سے دُور ہو جائے۔ پس قرآن میں جس اندھاپن کا ذکر ہے وہ دُوسری طرف کو جاتا ہے اور جو لوگ امامؑ سے وابستہ ہیں اُن پر اِس کا ہرگز ہرگز اطلاق نہیں ہوتا۔

یہاں پر ایک آیت ہے جو حٰمٓ السّجدہ [فصلت] کی سورت ہے اور جس کا نمبر ۴۱ ہے۔ آیت کا نمبر ہے ۴۴

یعنی ۴۱: ۴۴۔قرآن کے بارے میں فرمایا جاتا ہے: ''قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ''قرآن اہلِ ایمان کے لئے ہدایت اور شفا ہے،یعنی اِس میں رہنمائی ہے اور رُوحانی بیماریوں سے اِس میں شفا ہے۔''وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى'' اور جولوگ جیسا کہ ایمان لانا چاہئے ایمان نہیں لاتے ہیں تو اُن کے کانوں میں ایک گرانی ہے، بہرا پن ہے، ایسی صورت میں قرآن اِن کے حق میں نابینائی کا سبب ہے یعنی قرآن سے اُن کی نابینائی میں اضافہ ہوجاتا ہے یا کہ قرآن سے اُن کی نابینائی بن جاتی ہے،مطلب یہ کہ قرآن سے اُن کو دھوکا ہوتا ہے،قرآن کی وجہ سے نہیں، اُن کی اپنی وجہ سے، اُن کی اپنی غلطی سے۔قرآن کی دو حیثیتیں ہیں، جس طرح امام کی دو حیثیتیں ہیں کہ امامؑ سے کچھ لوگ بدک جاتے ہیں اور اِس بدکنے سے وہ یا تو گر جاتے ہیں یا کہ رستے سے بہت دُور گمراہ ہوجاتے ہیں۔اِسی طرح قرآن کے سمجھنے سے جولوگ قاصر ہیں یا جس طرح لوگ غلط انداز سے قرآن کو سمجھتے ہیں اپنی عقلِ جزوی کی وجہ سے یا غلط روایات کے سبب سے تو پھر اِس کے نتیجے میں قرآن سے اُن کو فائدہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اُن کے اندھا پنے میں اضافہ ہوجاتا ہے۔آپ نے سُن لیا کہ امام جس طرح بشر ہیں، امام جس طرح انسانی لباس میں ہیں، امام کا انسانی لباس میں ہونا بہت سے لوگوں کے لئے باعثِ گمراہی ہے۔امام کا عیال دار ہونا مثلاً امام کی فیملی کا ہونا، امام کا چلنا پھرنا، امام کا یہ لباس جیسا کہ وہ پہنتے ہیں زمانے میں، امام کا لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا، چلنا پھرنا، امام کا کسی ملک میں رہنا اور امام کی ہر بات، امام کا ہر کام کچھ لوگوں کے لئے باعثِ گمراہی ہے اور کچھ لوگوں کے لئے باعثِ رحمت ہے، اسی لئے میں نے کہا تھا کہ کچھ لوگ بدک جاتے ہیں۔بدکنا جو اصطلاح ہے وہ گھوڑے اور دوسرے جانوروں کے لئے مقرّر ہے، آپ نے خیال کیا ہوگا کہ بعض دفعہ کوئی جانور چلتے چلتے آتا ہے، گھوڑا وغیرہ تو آتے آتے وہ رستے میں کہیں کسی پتّھر کو دیکھتا ہے، درخت کو دیکھتا ہے یا کسی آدمی کو دیکھتا ہے یا کسی اور ایسی چیز کو دیکھتا ہے جس کو گھوڑا نہیں سمجھتا ہے اور گھوڑا اُس کو ایک آفت، بلا سمجھتا ہے، پھر یکا یک خوف کے ساتھ وہ بدک جاتا ہے۔اِس بدکنے سے کیا ہوتا ہے؟ اگر اُس کے اُوپر کوئی سوار ہے تو بعض دفعہ وہ گر جاتا ہے اور بعض دفعہ خود گھوڑے کو بدکنا باعثِ نقصان ہوتا ہے، وہ کہیں کسی درخت کے ساتھ ٹکر کھاتا ہے یا کہیں گر جاتا ہے یا کہیں دُور بھاگ جاتا ہے اور سوار کو گراتا ہے۔ابھی آپ تجزیہ کریں کہ گھوڑے کو کیا ہوا؟ حالانکہ درخت تھا، حالانکہ ایک آدمی تھا، بڑا اچھا مہربان آدمی تھا لیکن بدک گیا، اِس لئے کہ اُس کے اندر جو نفس ہے اُس نفس نے نہیں پہچانا اور اُس کو غلط فہمی ہوئی یا یوں کہنا چاہئے کہ شیطان اُس کے دل میں گھس گیا اور اُس کو گمراہ کر دیا۔شیطان نے آہستہ [سے] اُس کو کہا کہ دیکھو تمہارے لئے یہاں ایک آفت بیٹھی ہے، ایک بلا ہے۔تم اِس سے بھاگو جس قدر بھی ہوسکے تو وہ یکا یک بدک گیا۔

آپ قرآن میں انبیاء علیہم السّلام کی (history) کو دیکھیں تو اِسی طرح سے، یہ آج کی بات نہیں ہے۔جتنے بھی

خدائے بزرگ و برتر سے، خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السّلام دُنیا میں تشریف لائے وہ سب بشریت رکھتے تھے یعنی اُن کا جسم تھا، وہ جسمانی تھے، وہ چلتے تھے، پھرتے تھے، کھاتے پیتے بھی تھے اور اُن کے گھروں میں بچے تھے، اُن کی بیویاں تھیں۔ بدقسمتی سے جو نادان لوگ تھے اُن کی نگاہیں سب سے پہلے اِن خدا کے دوستوں کی بشریت پر جا کر ٹھہرتی تھی تو ہمیشہ کے لئے ایک کمزور انسان کی جو نگاہ ہے وہ خدا کے دوست کی بشریت پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ اولیاء اللہ میں جو خوبیاں ہوتی ہیں، اولیاء اللہ جو خدا کے خزانے ہیں اُن کو لوگ نہیں سمجھتے ہیں اور اُن کی جسمانیت میں جا کر بھٹک جاتے ہیں تو تمام پیغمبروں کے زمانوں میں جتنے بھی لوگ گمراہ ہو گئے، جتنے بھی لوگ نافرمان ہو گئے اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ خدا کو نہیں مانتے تھے، اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ فرشتوں کو نہیں مانتے تھے، اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ آخرت کو نہیں مانتے تھے، اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ رُوح کو نہیں مانتے تھے۔ آپ دیکھیں! باریکی سے دیکھیں! قرآن کو، سب کچھ مانتے ہوئے بھی جب اُن کی نگاہیں زمانے کے پیغمبر پر گئیں اور اپنی چھوٹی سی عقل سے سوچنے لگے کہ دیکھیں، پرکھیں جو سامنے سے ہدایت دینے والا ہے وہ کیسا ہے، تو شیطان نے اُن کے کان میں سرگوشی کے انداز سے کہا کہ دیکھو یہ بشر ہے، تم اِس کو نہیں ماننا تو شیطان کی بات میں آ گئے اور بعض دفعہ اُن کو پتہ بھی نہ چلا کہ شیطان اُن کے ساتھ سرگوشی کر سکتا ہے۔ شیطان کی آواز کو اُنہوں نے اپنے من کی آواز سمجھا پھر وہ گمراہ ہو گئے، بالکل اِسی طرح سے دُنیا زمانے میں امامؑ جو بشری لباس کے اندر رہے، جو انسانی جسم رکھتا ہے تو یہ جسم طلسمات ہے۔ طلسمات کا لفظ زبان پر آیا تو لازم ہے کہ میں طلسمات کو بیان کروں، طلسمات اُسے کہتے ہیں جو زمانۂ قدیم کی روایت کے مطابق کہیں کوئی خزانہ ہے کسی بادشاہ نے یا کسی حکیم نے کوئی خزانہ رکھا ہے تو اُس خزانے کی حفاظت کے لئے کوئی وہاں از قسم سحر، جادُو یا کوئی آفت بھی وہاں رکھی جاتی تھی تا کہ کوئی شخص اُس کو نہ چُرائے اور کوئی غیر اُس تک رسائی کر کے اُس خزانے کو نہ لے، تو اُس خزانے کے رستے ہی میں کوئی طلسمات بنائی جاتی تھی تو لوگ جاتے جاتے جب اُس طلسمات تک پہنچ جاتے تھے تو وہ وہاں پر رہ جاتے تھے یہ طلسمات اُن کو آگے نہیں بڑھنے دیتی تھی۔ بالکل اِسی طرح سے امام ہیں اور اُن کا جسمِ مبارک غیروں کے لئے طلسمات کا کام دیتا ہے۔ کیا قرآن میں یہ تصوّر نہیں دیا گیا ہے کہ خدا کا حجاب ہے، پردہ ہے؟ پردہ کیوں؟ آپ سوچنا اور زیادہ سوچنا کہ خدا کو پردہ کیوں اختیار کرنا چاہئے؟ خدا کو کیوں (open) نہیں ہونا چاہئے؟ خدا کو کیوں بالکل آشکار ہو کے اور سب کے سامنے کیوں نہیں آنا چاہئے؟ خدا کو کیوں اپنی شناخت سب لوگوں سے نہیں کروانی چاہئے؟ یہ سوال اپنی جگہ پر ہے لیکن قرآن میں جب کہا کہ حجاب ہے تو حجاب ہے۔ آپ کبھی فرصت میں پوچھ لینا کہ خدا کے سامنے حجاب یعنی پردہ ہونے کا ذکر کہاں ہے؟ تو کوئی بھی کم سے کم قرآن جاننے والا آپ کو بتائے گا کہ ہاں! حجاب ہے، تو کیا معراج کے قصّے میں یہ نہیں ہے کہ خدا نے آنحضرتؐ سے حجاب کے اندر سے بات کی تھی، تو جب حجاب ہے تو میں کہوں گا امام کا یہ جسم بھی اُس نور کے لئے حجاب کا کام

دیتا ہے۔حجاب اسلام میں بالکل صحیح ہے اِس پر کوئی بھی ذرا جاننے مسلمان بحث نہیں کرے گا،اِس کو قبول کرے گا،حجاب ہے، جب حجاب ہے تو یہ قانون بن گیا، جب حجاب ہے تو یہ اُصول ہوگیا اور پھر یہ سوال الگ ہے کہ وہ حجاب کس چیز کا ہے؟ یعنی حجاب کس چیز کا ہے؟ حجاب یہی بشریت ہے،حجاب یہی جسم ہے۔دین کا قانون ایک جیسا ہوتا ہے نا؟ تو یہاں کُلّی طور پر دین میں حجاب کا تصوّر ہے تو پھر ہمارے اور انسانِ کامل کے درمیان بھی حجاب ہونا چاہیئے۔جس طرح خدا اور انسانِ کامل کے درمیان حجاب ہے، ہمارے اور خدا کے درمیان حجاب ہے، پردہ ہے، ہمارے اور ہماری رُوح کے درمیان حجاب ہے، ہمارے اور ہماری رُوح کے درمیان حجاب ہماری بشریت ہے، ہماری نفسانیت ہے، ہمارے اعمال ہیں، ہماری کمزوری ہے۔ہمیں اگر رُوح کو دیکھنا ہے،خدا کو دیکھنے سے پہلے ہمیں اگر اپنی رُوح کو دیکھنا ہے تو ایک ایک کر کے یہ حجابات اُٹھاتے جائیں، اپنی کمزوریوں کو دُور کرتے جائیں گے،نفسانیت سے آگے بڑھیں گے، رُوح سے قریب تر ہو جائیں گے تو ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ ہم اپنی رُوح کو بے حجاب دیکھیں گے، پردے کے بغیر دیکھیں گے۔بالکل اِسی طرح سے امام کی بشریت، امام کی جسمانیت یا امام کا جسم، امام کا ظاہری ہر کام، یہ حجاب ہے۔میں نے کبھی کہا تھا کسی روایت کے حوالے سے کہ ایک انسان اور امامؑ کے درمیان سات سَو پردے ہوا کرتے ہیں، سات سَو حجابات ہوا کرتے ہیں،(diagram) کو آپ نے اُٹھا کر دیکھا ہے،تو اِن سات سَو حجابوں میں سے آگے بڑھنا اِس طرح سے ہے کہ ہم علم اور عبادت سے آگے بڑھیں۔علم اور عبادت سے آگے بڑھیں گے تو ایک دن ہم کو امام کا نور جو خدا کا نور ہے نظر آئے گا کہ جس کے دیکھنے سے ہماری آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ہم مشکل سے دیکھ سکیں گے، کچھ سیکنڈوں کے لئے دیکھ سکیں گے امام وہ نور ہے،اِس کے باوجود امامؑ کے یہ حجابات ہیں،تو اِس وجہ سے دُنیا کے اندر دو گروہ ہو گئے۔ایک گروہ وہ ہے جس کو اقرار ہے،جس کو آگے بڑھنا ہے،نور کو نور ماننا ہے اور دُوسرا گروہ وہ ہے جو اِس نور سے منکر ہے اور اِس کو نہیں سمجھتا ہے تو چنانچہ آج ہم نے اندھا پن کے موضوع پر قرآن کی روشنی میں،قرآن کی آیات کی وضاحت کرتے ہوئے کچھ گفتگو کی،تو اِسی کے ساتھ میں یہاں رُک جاتا ہوں اور آپ عزیزوں میں سے کسی کا اگر اِس سلسلے میں کوئی سوال ہو تو وہ کیا جا سکتا ہے، پوچھا جا سکتا ہے۔شکریہ،بہت مہربانی آپ کی توجّہ کی۔

اِنہوں نے پوچھا کہ قرآن کی زبان میں حجاب کو کیا کہتے ہیں؟ تو عرض ہے کہ یہ حجاب خود عربی ہے اور قرآن میں اِس کو حجاب کہا گیا ہے اور خصوصاً ایک آیت کے اندر خدا کے حجاب ہونے کا ذکر بھی ہوا ہے"وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا"(۴۲:۵۱) کوئی بھی انسان اِس قابل نہیں ہے کہ فوراً ہی خدا سے کلام کر سکے مگر ہاں! جب خدا کے نور کا سب سے اُونچا دیدار ہوگا تو اُس وقت اشارے سے بات ہوگی نورِ خدا کی طرف سے اور دوسرے درجے میں حجاب سے کلام ہوگا اور تیسرے درجے میں کوئی رسولؑ وحی کرے گا۔وہ رسولؑ فرشتہ بھی ہو سکتا ہے، وہ رسول بشر

بھی ہوسکتا ہے،تو اُو پر سے نیچے کی طرف دیدارِ خداوندی یا کلامِ خداوندی کے یہ تین درجے ہیں۔اب اِس آیت کے اندر اُو پر سے نیچے کی طرف ذکر ہے،سب سے اُو پر جب حجاب اُٹھ جائے گا،کوئی ایسی رُوح،کوئی ایسا بندہ جو انتہائی مشقّت سے اِس مقام کو حاصل کرتا ہے تو نورِ خداوندی سامنے آتا ہے تو اُس وقت کلام نہیں ہوگا بلکہ ایک اشارہ ہوگا،یہ سب سے اُونچے درجے کی بات ہے۔اُس کے بعد جب کلام ہوگا تو پردے کے پیچھے سے،حجاب کے پیچھے سے کلام ہوگا۔اُس کے بعد نچلے درجے میں خدابذاتِ خود کلام نہیں کرے گا،کسی رسول کے توسّط سے کہ وہ رسول انسانِ کامل ہو،پیغمبر ہو،امام ہو یا کوئی فرشتہ ہوتو اِس وسیلے سے خدا کسی بشر سے کلام کرے گا،یہ اُو پر سے نیچے کی بات ہوئی۔اب اِس کو دُہرائیں،نیچے سے اُو پر کی طرف جائیں،سب سے پہلے مومن سے خدا کلام کرے گا رسول کے ذریعے سے یا کسی فرشتے کے ذریعے سے۔اِس کے بعد اگر مومن کی زیادہ ترقّی ہوئی تو خدا پردے کے پیچھے سے،حجاب کے پیچھے سے کلام کرے گا۔اِس کے بعد اور آخری حد تک ترقّی ہوئی تو خدا کا نور حجاب کے بغیر سامنے آئے گا مگر اُس وقت کلام نہیں کرے گا،ایک یاد و اشارے کرے گا،یہ ہے بطریقِ اجمالاً مختصراً رُوحانی مراتب۔تمام رُوحانی درجے اِن تین درجوں میں جمع ہیں،مومن کی ابتدائی ترقّی یہ ہے کہ وہ پیغمبر کے وسیلے سے خدا کے کلام کو سُنے،امامؑ کے وسیلے سے خدا کے کلام کو سنے،یہ خدا کا کلام ہے کیونکہ خدا نہ صرف ذاتی طور پر کلام کرتا ہے بلکہ وسیلے سے بھی،توسّط سے بھی کلام کرتا ہے،تو امامؑ کا کلام،رسولؐ کا کلام،خدا کا کلام ہے۔اِس کے آگے اگر ترقّی ہوئی تو پردے کے پیچھے سے کلامِ خداوندی سُنائی دے گا،اُس کے اُو پر انتہائی ترقّی ہوئی تو نورِ خداوندی سامنے آئے گا کیونکہ اُس کا وعدہ ہے اور خود خدا نے فرمایا ہے،اُس وقت کوئی تفصیلی کلام نہیں ہوگا،ایک دو پُرحکمت اشارے ہوں گے،ایسے اشارے کہ اُن اشاروں کے اندر دُنیا و آخرت کا سارا علم سمو کر محدود ہوگیا،دُنیا و آخرت کا لامحدود علم اُن دونوں اشاروں میں سمو کر محدود ہوگیا،ایسے اشارے ہوں گے۔سوال حجاب کے بارے میں تھا تو حجاب کو حجاب کہا جاتا ہے اور حجاب اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے،اسلام کے بنیادی اُصولات میں سے ہے۔

اِنہوں نے لوگوں کی اُس عادت کے بارے میں سوال کیا کہ کوئی کسی پر جادو کرتا ہے یا یہ کہ کوئی اپنے کسی نقصان کو یا اپنی آمدنی کے نہ ہونے کو کسی دُوسرے انسان کا جادو سمجھے تو اِس سلسلے میں کیا آپ کا خیال ہے، اِنہوں نے سوال کیا یعنی جادو کے ہونے،نہ ہونے اور اُس کے متعلّق کیا تصوّر ہے؟اصل میں بات یہ ہے کہ جادو تو ہے قرآن میں اِس کا ذکر ہے لیکن لوگ جس طرح سمجھتے ہیں ایسا نہیں ہے،یہ کہ جادو ہے مگر خدا کے اِذن سے ہے،ہر چیز خدا کے اِذن کے تحت ہے اور اب ہم کو خدا کا اِذن سمجھنا چاہیئے کہ اُس خدا کے اِذن میں کچھ انصاف ہے یا ظلم؟ تو کوئی بندۂ مومن یہ نہیں کہہ سکے گا کہ خدا کا جو اذن ہے وہ یعنی اُس میں عدل نہیں ہے،اُس میں ظلم ہے،تو خدا کے اذن پر ہمارا بھروسہ ہونا چاہیئے،مختصر بات۔جادو ہے لیکن خدا کے اذن سے وہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے یا کسی کو فائدہ دے سکتا ہے۔اب ہمیں جادو کی طرف دیکھنا چاہیئے یا

خدا کے اذن کی طرف دیکھنا چاہیئے، میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہمیں خدا کے اذن کی طرف دیکھنا چاہیئے اور ہمیں خود کو ایسا بنانا چاہیئے کہ خدا کا جو اذن ہے وہ ہماری وکالت کرے کیونکہ خدا کے ناموں میں سے ایک نام وکیل ہے تو جہاں دُنیا کے اندر ہمارا کوئی اچھا دوست ہوتا ہے اُس پر ہم اعتماد رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلان افسر ہمارا دوست ہے تو اُس کے ہوتے ہوئے ہمیں کیا غم ہے؟ ایسا بھی کہہ سکتے ہیں جب دُنیا کے ایک انسان کے متعلّق ہمارا اعتماد اتنا زبردست ہے تو خدا جو ہمارا وکیل ہے اور ہمارا نگہبان ہے، اُس کی تمام صفات کو دیکھیں تو وہ ہمارے مفاد میں ہے، اُس صورت میں ہمیں خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ خدا کے اذن کا جو دروازہ ہے وہ ہمارے نقصان کے لئے نہیں کُھل سکتا ہے یعنی خدا اپنے ایک دوست کے نقصان کے لئے کسی کو اجازت نہیں دے سکتا ہے اور اگر ہمارا تصوّر یہ ہے تو کوئی غم نہیں ہے۔ ہمیں خدا کو دیکھنا چاہیئے، خدا پر یقین رکھنا چاہیئے اور کسی جادو کے ہونے اور نہ ہونے کا ہمیں کوئی غم نہیں ہونا چاہیئے، اب یہ نہ ہو تو پھر کیا ہو گا؟ جیسا کہ آپ نے مثال [میں] بتایا، اُس کے مطابق یہ خواہ مخواہ کی یہ ایک کمزوری ہے، یہ ایک غلط نفسیات ہے، یہ ایک غلط نفسیات کسی کے ذہن پر سوار ہو جائے تو نفسیاتی طور پر اُس کو تکلیف ہو گی۔ کیا ضمانت ہے کہ ایک شخص کتاب کو دیکھے، فال نکالے اور وہ یہ تحقیق کر کے سچ سچ بتائے کہ ہم پر کسی نے جادو کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شخص گمان سے بولتا ہو، اپنی کوئی شہرت مقصود ہو، اپنا کوئی فائدہ مطلوب ہو تو وہ کیا جانتا ہے کہ انسان کس قدر باریکی سے جائے، اگر جادو کیا بھی کیا گیا ہو تو وہ کیا جانتا ہے کہ ایک شخص نے جادو کیا ہے، کہاں سے اُس کو معلوم ہو گیا، تو کوئی بھی دانشمند جو علم جانتا ہے وہ یہ نہیں بتا سکتا ہے کہ یہ چیز اِس طرح سے آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے، تو اِس لئے جادو ہے مگر خدا کے اذن سے ہے۔ قرآن اور اُس کا انڈیکس اور قرآن آپ کے سامنے موجود ہے۔ میں وہ آیت بتاؤں گا کہ سلیمانؑ پیغمبر کے زمانے میں لوگ جنّات سے مل کر رہتے تھے اور جنّات میں بہت سی شرارت کی باتیں ہوتی ہے تو جنّات لوگوں کو جادو کی تعلیم دیا کرتے تھے پھر لوگ کیا نہیں کرتے تھے؟ بہت کچھ کرتے تھے لیکن خدا کے اذن کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا ہے تو خدا کا اذن ہے۔ خدا کا اذن ہو تو جادو سے کسی کو نقصان ہو اور اذن نہ ہو تو جادو ضائع ہو جائے اور فضول جائے، لہٰذا ہمیں اذن کے دروازے کی طرف دیکھنا ہے یعنی اذن کے مالک کو اپنا وکیل بنانا ہے، اُسی کے دَر کی طرف دیکھنا ہے اور خدا میں پناہ لینا ہے۔ قرآن میں یہ بھی تعلیم دی ہے: ''قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' (۱۱۴:۱) لوگوں کو تعلیم دیتے ہوئے کہیئے میں خود کو اللہ کے حضور میں محفوظ کرنا چاہتا ہوں، اللہ کی پناہ میں ہو جانا چاہتا ہوں۔ اللہ کی پناہ میں ہو جانا ضروری ہے یعنی خود کو اللہ کی حفاظت میں، اللہ کی پناہ میں محفوظ کر لینا ہے۔ جس طرح دُنیا کی مثال میں کوئی شخص اپنی دکان کو، اپنے مکان کو، اپنے مال کو، اپنے پیسوں کو حکومت کے وہاں (registered) کراتا ہے، بیمہ کراتا ہے لیکن یہ تو بہت چھوٹی بات ہے۔ حکومت کیا کر سکتی ہے؟ یہ کہ کچھ پیسے ملتے ہوں گے حکومت سے یا کسی کمپنی سے لیکن جان تو نہیں بچا سکتا ہے کوئی شخص، نہ حکومت، آگ لگنے سے کوئی ایسی ضمانت نہیں

ہے۔ یہ تھوڑی بہت مثال ہے لیکن اللہ کے وہاں ضمانت ہو، حفاظت ہو، پناہ لی جائے تو وہاں پر سب کچھ ہے، سب کچھ ہے۔ اِس لئے ہمیں دُنیا کے کسی شرّ سے نہیں ڈرنا ہے، خدا نے بہت سی مثالوں میں سمجھایا، کہا کہ تم لوگوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا، اگر ہمارا ایمان ہے اِس پر تو ہمیں دُنیا کی کسی آفت سے ڈرنا نہیں ہے، خدا سے ڈرنا ہے اور اِس طرح سے ہم خود کو نہیں بچا سکتے ہیں کہ کسی ملّا کو کچھ پیسے دیں، اُس کو بلائیں، کہیں کہ کہو کہ مجھے پر کسی نے جادو کیا ہے یا نہیں کیا ہے، یہ طریقہ غلط ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ خود کو اللہ کے حضور میں محفوظ کریں، اللہ کی پناہ میں ہو جائیں تو یہ ہے اسمٰعیلی مذہب کا طریقہ۔

اِنہوں نے ایک اہم سوال یہ کیا کہ آپ نے کہا کہ جادو ہوتا ہے اور اِس کے لئے خدا کے حضور میں خود کو محفوظ کر لینا چاہئے، اِنہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ پر کسی نے جادو کیا تھا، اِس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا رسول اللہؐ نے خود کو، اپنی ہستی کو اپنی ذات کو اللہ کے وہاں محفوظ نہیں کیا تھا؟ یہ کیوں ایسا ہوا؟ اور اُس طرح سے اگر کچھ تکلیف ہوتی ہے کسی اسمٰعیلی کو یا کسی مومن کو تو اُس کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ اِن کا سوال اہم ہے اور بہت عمدہ ہے اور اِنہوں نے جو مثال بتائی وہ بھی صحیح ہے۔ ہم یہ مثال اپنی تقریروں میں کئی دفعہ یعنی بتا چکے ہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی (writing) میں بھی آئی ہو کہ واقعاً رسول اللہؐ پر ایک یہودی عورت اور ایک مرد نے جادو کیا تھا جس کے مدافع کے طور پر معوذتین کی دو سورتیں نازل ہوئیں: ''قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' (۱۱۴:۱) اور ''قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ'' (۱۱۳:۱) اصل سوال یہ ہے کہ حبیبِ خدا جو ہر طرح سے نور تھے اور خدا کے تمام احکام پر عمل کرنے کا نمونہ تھے تو اُن پر یہ جادو کیوں اثر انداز ہو گیا؟ اور [وہ] خدا کے حضور میں محفوظ تھے، خدا اُن کے وکیل تھے، خدا اُن کے کارساز تھے۔ اِس کا جواب یوں ہے کہ ہادیٔ برحق کو مصلحتاً کچھ تکالیف لینی ہوتی ہیں۔ اگر ہادیٔ برحق پیغمبر اور امام اپنی ہستی کو، اپنے جسم کو ہر طرح سے محفوظ کرے اور اُس میں ہمارے لئے کوئی ایسا نمونہ نہ ہو، کوئی ایسی مثال نہ ہو کہ جس کو دیکھ کے ہم سمجھیں، عبرت لیں کہ تکلیف آتی ہے مصیبت آتی ہے، اُس کو برداشت کرنے کا طریقہ، اُس کو دُور کرنے کا سلیقہ کس طرح ہو، تو اِس عملی ہدایت سے ہم محروم ہو جاتے۔ لہٰذا خدا نے ایسے جادو کو اجازت اِس لئے دی کہ اپنا حبیب اِس کو اپنے جسم پر لے اور پھر اِس مرض کے لئے کیا دَوا چاہئے اور کس طرح اِس کا علاج ہو اِس کا عملی نمونہ (demonstration) اُمّت کے لئے اور مومنین کے لئے پیش کیا جائے۔ چنانچہ یہ ہو گیا اور ہونے کے بعد معوذتین کی دو سورتیں نازل ہوئیں اور پھر اِن کے پڑھنے سے وہ جادو ٹوٹ گیا اور پھر اُمّت کے لئے، مومنین کے لئے ایک عملی ہدایت ثابت ہو گئی۔ پس اِس سے ہم یہ سمجھ گئے کہ چاہے وہ سورت پڑھیں یا چاہے یعنی عبادت کے (escence) کو لیں، عبادت کریں، بندگی کریں، تسبیح پڑھیں، خدا سے رُجوع کریں، امامؑ سے رُجوع کریں اِس کا علاج عبادت کے طور پر ہو، رُوحانی طور پر ہو، نہ کہ کسی ملّا مولوی سے رُجوع کر کے پھر اُس کے وسیلے سے اور اگر کسی ملّا مولوی سے صلاح لی جائے تو اِس میں باعثِ گمراہی ہو گی بلکہ یہ ہے کہ خود عبادت و بندگی کی جائے۔

اگر کسی مومن پر ایسی تکلیف آنے کا شُبہہ ہوتا ہے تو چونکہ مومن پر جو چیز آتی ہے وہ آزمائشی ہوتی ہے، (permanent) یعنی مستقل نہیں ہوتی ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے [کہ] مومن کیا سمجھتا ہے، یہ دیکھنے کے لئے [کہ] مومن کا ایمان کس قدر مضبوط ہے، کتنا وہ توکل رکھتا ہے اپنے خداوند پر، تسبیح کس طرح پڑھتا ہے، تکلیف کے وقت وہ خدا سے رُجوع کرتا ہے یا نہیں کرتا ہے۔ اگر خدا کی مصلحت کو وہ سمجھتا ہے، خدا سے رُجوع کرتا ہے، عبادت کرتا ہے، آنسو بہاتا ہے تو بہت کم دنوں میں وہ تکلیف دُور ہو جائے گی اور اگر مان لیا جائے کہ جادو تھا تو یقیناً وہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر مومن کس چیز کا نام ہے؟ مومن تو باور کرنے کو کہا جاتا ہے اور باور تو یہ کرنا چاہئے کہ خدا برحق ہے اور باور یہ بھی کرنا چاہئے کہ خدا کے اذن سے ہوتا ہے اور خدا کے اذن سے اُس کے دوست کو کچھ دن کے لئے کوئی تکلیف آ گئی ہے تو خدا کے کنٹرول کی چیز خدا کے حکم سے دُور ہو جائے گی، ایسی تکلیف، ایسی بیماری، تو خدا سے رُجوع کرنا چاہئے، اِدھر اُدھر نہیں بھٹکنا چاہئے، تو یہ تو ناکامی اور نامرادی ہوئی کہ اگر خدا کو چھوڑ کے، خدا کے وسائل کو چھوڑ کے کمزور انسانوں کے پیچھے پڑتا ہے کوئی تو یہ بہت کمزوری ہوئی، براہِ راست خدا سے رُجوع کرنا ہے۔ دیکھیں خدا کیا فرماتا ہے

''وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ'' اے رسول! جب میرا کوئی بندہ میرے بارے میں پوچھتا ہے ''عَنِّیْ'' میری بابت، میرے متعلّق پوچھتا ہے ''فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ'' اُسے کہئے کہ میں بہت ہی نزدیک ہوں، اِس نزدیکی کا کیا مطلب؟ یعنی (third person) کی یہاں ضرورت نہیں ہے، میں قریب ہوں۔ ''وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ'' بلانے والے، پکارنے والے کی پکار کو میں سنتا ہوں اور جواب بھی دیتا ہوں، ہاں! بولتا ہوں ''اِذَا دَعَانِ'' جس وقت کہ وہ پکارتا ہو، بلا تاخیر میں اُس کو جواب دیتا ہوں ''اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ'' تو چاہیے کہ میری پکار کو میری دعوت کو بھی وہ قبول کرے، میری دعوت کو بھی وہ سنے ''وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ'' اور مجھ پر ایمان لائے، بھروسہ کرے، اعتبار کرے ''لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ'' تا کہ وہ ہدایت پائیں گے (۱۸۶:۲) اِس میں خدا کے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قریب ہے۔

ایک اور آیت میں ہے: وہ رگِ جان سے بھی قریب ہے (۱۶:۵۰)۔ جب خدا قریب ہے تو قریب والے کے قریب ہوتے ہوئے ایک تیسرے شخص کی کیا ضرورت ہے؟ تیسرے شخص کی ضرورت ہے صرف اور صرف اُس وقت کہ وہ ہم کو حقیقت کی تعلیم بتائے۔ ایسا اگر کوئی شخص ملتا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے، ایسا شخص نہیں ملتا ہے ہم کو، بھٹکاتا ہے، گمراہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم خاموش رہو، تم آرام سے بیٹھو، میں تمہاری جگہ پر عبادت کروں گا تو ایسے شخص کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا تو چاہتا ہے کہ ذاتی طور پر مومن رُجوع کرے، خود بولے، خدا جانتا ہے ہر زبان کو، خدا جانتا ہے ہر دل کی کیفیت کو۔ خدا چاہتا ہے کہ ہر بندہ ذاتی طور پر خدا سے رُجوع ہو جائے اور تیسرا کوئی شخص بیچ میں نہ آئے، ہاں! وہی شخص جو کہ خدا اور

بندے کے قُرب کو سمجھاتا ہو، توجّہ دلاتا ہو کہ خود ہی کرو، تم میں وہ ساری کیفیات، تم میں وہ ساری قابلیتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں۔ اگر تعلیم کچھ اِس قسم کی ہے تو زہِ قسمت، خوش بختی ہے اُس بندے کی کہ ایسا اُستاد بندۂ مومن کی ذات کے اندر جو خوابیدہ صلاحیتیں ہیں اُس کو اُجاگر کرتا ہے اور اُس کو اُبھارتا ہے کہ ذاتی طور پر کوشش کرو، رستہ بتلاتا ہے کہ اِس کے دل کے اندر وہ چُھپا ہوا خزانہ ہے۔ یہ بات نہ ہو تو کسی شخص کی کوئی ضرورت نہیں ہے، خدا چاہتا بھی ہے کہ جس پر تکلیف ڈالی گئی ہے وہی دردناک آواز میں پکارا کرے، خدا دردناک آواز کو سنتا ہے اور جس کو تکلیف نہیں ہے اُس کی نہیں سنتا ہے۔ ہاں! سنتا ہے ایک ایسے مومن کی جو کہ اُس درد میں شریک ہو کر اپنے اندر درد پیدا کر سکتا ہے اور دردناک آواز میں پکار سکتا ہے تو تب سنتا ہے اور ایسا نہیں ہے آدمی خوب تازہ ہے، تندرست ہے، ہٹّا کٹّا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہاری جگہ پر دُعا کروں گا تو پھر ایسے دل کی پکار کو، دُعا کو خدا رَد کرتا ہے، اُس کے منہ پر دے مارتا ہے خدا۔ چاہتا یہ ہے خدا کہ جہاں درد ہے تو اُس درد کے ساتھ بہتے ہوئے آنسوؤں سے پکارا کرے، وہ سُنے گا وہ ضرور سُنے گا اور سُنے گا اور اُس کے لئے باور کرنا ہے، مومن کا یہ کام ہے، مومن کا یہ نام ہے، مومن کے یہ معانی ہیں۔ مومن معنی؟ باور کرنے والا، خدا اور رسولؐ کی باتوں پر باور کرنے والا، یہ مومن کے معانی ہیں۔

چلو دُعا مانگیں اپنے سب دوستوں کی مشکلات کے لئے لیکن بڑی ہمدردی سے دُعا مانگیں تو قبول ہو جائے یا یہ ہے کہ اگر وہ دوست ہمارے درمیان میں ہے تو ہماری اِس کوشش سے وہ جاگیں گے اور وہ جو دُعا کریں گے اِس اجتماع میں، شاید ان کی دُعا مولا بہت جلد قبول کرے گا۔ ہماری دُعا صرف ایک بہانہ ہوگا، ایک تحریک ہوگی کہ ہم نے یاد دلایا اور اُن کو توجّہ دلائی لیکن اصل دُعا کون سی ہوگی؟ ہر دردمند دل کی دُعا اصل دُعا وہی اور خدا کو کس کی پکار پر رحم آئے گا؟ اُس کی پکار پر رحم آئے گا جس کو دُکھ ہے لیکن بحیثیتِ مومنین کے ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ ہم ہمدردی کے جذبے کو اُبھاریں، اپنے اندر ایک ایسا درد پیدا کریں۔ گو کہ وہ درد کسی اور میں ہے لیکن ہم یہ کوشش کریں کہ اُس درد میں ہم شریک ہو جائیں، کسی دوست کے درد میں شریک ہونے کو ہمدرد کہا جاتا ہے، تو یہ صفتِ ہمدردی انسان کی صفت ہے۔ ایک اُستاد [شیخ سعدی] کہتا ہے:

بنی آدم اعضای یکدیگرند　　که در آفرینش زیک گوهرند

اولادِ آدمؑ جو ہیں وہ ایک دوسرے کے اعضاء ہیں۔ اِس لئے کہ یہ ایک ہی جوہر سے، ایک ہی رُوح سے، ایک ہی عناصر سے پیدا کئے گئے ہیں۔

چو عضوی به درد آورد روزگار　　دگر عضوها را نماند قرار

جب زمانہ کسی عضو کو دکھاتا ہے تو دوسرے اعضاء کو آرام نہیں ہوتا ہے مثلاً پاؤں میں درد ہے اور بہت درد ہے تو

ساری رات جو آنکھ پہلے سوتی تھی اب کہاں سوتی ہے؟ اِس لئے کہ پاؤں کو درد ہے۔ گو کہ پاؤں الگ ہے، آنکھ اِس سے اُوپر ہے لیکن اِن اعضاء کے آپس میں ایک ربط ہے، ایک وابستگی ہے، ایک رشتہ ہے، اِن کے درمیان میں انسلاک ہے تو جس کی وجہ سے ایک عضو کو جہاں درد ہوتا ہے تو دوسرے عضو میں قرار نہیں ہوتا ہے۔ جب اِس قول کے مطابق سب بنی آدمؑ کے آپس میں ہمدردی کا جذبہ دیا گیا تو اُس سے بڑھ کر مومنوں کی جو مثال ہے وہ بہت ہی بالا ہے، اِس لئے کہ مومنین حقیقت میں نہ صرف ایک دُوسرے کے اعضاء ہوتے ہیں لیکن وہ ایک دُوسرے کی رُوح ہوا کرتے ہیں۔ اِس لئے آپ دُعا مانگیں مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک، سیّارۂ زمین پر جتنے بھی مومنین بستے ہیں الٰہی یا مولا! اُن میں سے کسی کو کوئی دُکھ ہو، کوئی درد ہو، کوئی بیماری ہو، اُن کو تکلیف ہو، اُس کے لئے تو از راہِ عنایت شفا دینا، اُس کے دُکھ درد کو دُور کر دینا خداوند! خداوند!۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: ثناوزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

Click here
for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: کائنات کی ہر چیز علم کے گھیرے میں ہے

کیسٹ نمبر: ۶۶ تاریخ: فروری، ۱۹۸۲ء کراچی

عزیزانِ من! قرآنِ مقدّس میں ارشاد ہے کہ پروردگارِ عالم نے ہر چیز کے اندر علم رکھا ہے یا یہ کہ ہر چیز علم کے گھیرے میں ہے، ہر چیز علم کے گھیرے میں ہے اور اِس سلسلے میں پوری کائنات علم کے گھیرے میں ہے۔ اِس طرح کہ فرمایا گیا ہے کہ: ''رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا '' (۴۰:۷)۔ بارِ خدایا تُو نے ہر چیز کو رحمت میں اور علم میں گھیر لیا ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو رحمت نفسِ کُلّی ہے اور علم عقلِ کُلّی ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ اِس پوری کائنات کو نفسِ کُلّی نے گھیر لیا ہے، اِسی لئے نفسِ کُلّی کو (universal soul) یا کہ عالمگیر رُوح کہا جاتا ہے۔ اِس لئے کہ اِس ساری کائنات کی ایک رُوح ہے جو عظیم رُوح ہے، جو تمام رُوحوں کا سمندر ہے، تو نفسِ کُلّی نے اِس پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے یعنی رُوحِ کُلّی اِس عالم پر محیط اور حاوی ہے۔ پھر اِس پر عقلِ کُلّی محیط ہے یعنی جس طرح پوری کائنات نفسِ کُلّی کے گھیرے میں ہے اِسی طرح رُوحِ کُلّی، عقلِ کُل کے گھیرے میں ہے۔ ہم اِس مثال کو انفرادی ہستی میں بھی دیکھتے ہیں یعنی ہم ایک انسان پر جب غور کرتے ہیں تو یہی اُصول اور یہی کُلیّہ درست ثابت ہو جاتا ہے، وہ اِس طرح سے کہ ہر انسان کا ایک جُداگانہ جسم ہے، وہ جسم اُس آدمی کی رُوح کے گھیرے میں ہے اور رُوح پر عقل کا کنٹرول ہے، تو ہر شخص کی ہستی یا کہ شخصیّت کو رُوح گھیر رہی ہے اور رُوح کو عقل گھیر رہی ہے، تو جیسی صورتِ حال اِس انفرادی ہستی کی ہے جزوی طور پر، وہی صورتِ حال کائنات کی ہے کُلّی طور پر، تو یہاں بھی یعنی آدمی میں بھی جسم کو رُوح نے گھیر لیا ہے اور رُوح کو عقل [نے]، تو یہ ہوئے معنی اِس آیت کے جس میں فرمایا گیا تھا کہ: ''رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا '' (۴۰:۷) اے خداوند! تُو نے ہر چیز کو رحمت اور علم میں گھیر لیا ہے۔

اب اِس معنی میں اور اِس تشریح میں جب معلوم ہوا کہ رحمت رُوح ہے اور علم عقل ہے تو پھر اِسی قیاس پر ہم یہ نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ اِس کائنات کے اندر کوئی ذرّہ ایسا نہیں ہے جس کو ایک رُوح نے نہ گھیرا ہو اور اُس رُوح پر ایک عقل محیط نہ ہو، تو پوشیدہ طریقے سے مشاہدہ کیا جائے تو ہر ذرّے کے اندر ایک رُوح ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور اُس رُوح پر ایک عقل محیط ہونے کا پتہ چلتا ہے، یہ ہے۔ اب جہاں ہم کو یہ کُلیّہ ملا، ہم کو یہ اُصول ملا کہ ہر چیز میں رحمت ہے اور علم ہے یا

کہ ہر چیز کو رحمت نے اور علم نے گھیر لیا ہے تو چلئے چلتے ہیں قرآن کے مختلف موضوعات میں دیکھتے ہیں اور مختلف اوصاف کو دیکھتے ہیں، مختلف چیزوں کو دیکھتے ہیں، مختلف باتوں کو پرکھتے ہیں، تو اُن میں سے ہر ایک میں علم ہے اور علم کے بغیر کوئی چیز نہیں۔ مثال کے طور پر جس تقویٰ کی ہم تعریف کرتے ہیں، ہم کیا تعریف کرتے ہیں! قرآن میں خود تعریف ہے تو وہ تقویٰ بھی علم کے تحت ہے کیونکہ ابھی ابھی بات ہوئی قرآن کی روشنی میں کہ ہر چیز میں علم ہے یا کہ ہر چیز علم کے تحت ہے تو تقویٰ بھی علم کے تحت ہے۔ پھر چلتے ہیں صبر کی طرف تو صبر کی تحقیق کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ صبر بھی تو علم کے تحت ہے اور علم کے بغیر کوئی صبر نہیں۔ پھر جاتے ہیں دُوسرے انسانی اوصاف کی تحقیق کرنے کو مثلاً خوفِ خدا، جب ہم خوفِ خدا کی تحقیق کے لئے جاتے ہیں کہ وہ تقویٰ کی ایک دُوسری صورت ہے یا تقویٰ کا ایک اور نام ہے تو اُس کے متعلّق بھی علم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی علم کے تحت ہے۔ چلیں! عفو کی طرف جاتے ہیں، بخشش کی طرف جاتے ہیں، جو خدا کی صفت ہے تو اُس میں بھی علم کے ہونے کا ثبوت ملتا ہے یعنی خداوندِ عالم آج دُنیا میں یا کل قیامت میں جن کو معاف کرے گا وہ بھی ایک علم کے تحت ہے، علم کے بغیر نہیں ہے۔

اب ایک اور راستہ یہ نکلا کہ جتنی خدا کی صفات ہیں یا جتنے خدا کے نام ہیں اُن کے اندر بھی علم کی تعریف ملتی ہے یا کہ اُن میں سے ہر اسم اور ہر صفت کا تعلّق علم کے ساتھ ہوتا ہے۔ چونکہ قرآن نے ہم کو یہ بتایا تھا کہ ہر چیز میں علم ہے تو ہر رُوحانی چیز میں، ہر معنوی چیز میں، ہر علمی چیز میں، ہر قرآنی چیز میں اور ہر ظاہری و مادّی چیز میں علم ہے، تو دُنیا کے اندر بھی دیکھتے ہیں کتنے کام ہیں جن کے اندر علم ہے اور جن کاموں کے بھیدوں کو ہم نہیں سمجھتے ہیں تو اُن میں بھی علم ہے اور علم کے بغیر حکمت کے بغیر کوئی شئ نہیں ہے، تو ایک طرف سے یہاں اِس موضوع میں علم کی تعریف ہو جاتی ہے، علم کی تعریف ملتی ہے اور دُوسری طرف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خداوندِ عالم نے علم کو ہر چیز کے لئے وسیلہ بنایا ہے، جو بھی چیز چاہئے، جو بھی بات چاہئے، جو بھی عمل چاہئے، جو بھی قول چاہئے وہ علم ہی کی روشنی میں ہوگا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ عمل کی بہت بڑی تعریف ہے یعنی دین میں کام کرنے کی بہت بڑی اہمیّت بتائی گئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کو پتہ چلے گا کہ علم کی روشنی میں ہر عمل ہونا چاہئے اور اگر کسی عمل میں علم کی روشنی نہیں ہے اور کوئی کام بامعرفت نہیں ہے، بے معرفت ہے مثلاً عبادت اگر معرفت کے بغیر ہے، علم کی روشنی کے سوا ہے تو ایسی عبادت کو خدا قبول نہیں فرماتا اور یہی وجہ ہے کہ دانشمند مفسرین نے کہا ہے جہاں خداوندِ عالم کا یہ ارشاد ملتا ہے کہ: ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ'' (۵۶:۵۱) اور ہم نے جنّات و انسان کو سوائے بندگی کے مقصد کے اور کسی بات کے لئے پیدا نہیں کیا، تو وہ مفسرین بتاتے ہیں کہ یہاں اِس عبادت سے ایسی عبادت مُراد ہے جو بامعرفت ہو، جو معرفت کی روشنی میں ہو یعنی خداشناسی کے ساتھ عبادت ہو، تو ایسی عبادت خدا کے حضور میں قبول ہوتی ہے۔ جہاں کوئی عمل، کوئی بندگی معرفت کے بغیر، شناخت کے بغیر ہوتی ہے تو وہ جانوروں کے کام

کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ محنت وہ جانور کرتے ہیں جن کو انسان اپنے فائدے کے لئے استعمال کر رہا ہے مثلاً بیل، گدھا، گھوڑا، اونٹ، وغیرہ، یہ تو دن بھر حرکت کرتے رہتے ہیں، کام کرتے رہتے ہیں لیکن کیا اِن کو خدا کی طرف سے کوئی اجر و صلہ ملنے کا امکان ہے یا کوئی ایسا وعدہ ہے یا قرآن میں ایسا کوئی ذکر ہے کہ اِن جانوروں کو اِس لئے کوئی بدلہ ملے گا کہ اِنہوں نے دُنیا کے اندر بہت کچھ مشقّت اُٹھائی؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے، ایسا کوئی قانون نہیں ہے۔ لہٰذا لوگوں کے اُس فعل یعنی عمل کی کوئی اہمیّت نہیں جو کہ وہ شاخت کے بغیر کر رہے ہیں، تو اِس لئے شاخت کی، علم کی بے حد ضرورت ہے۔ دیکھیں کہ مومن کے سامنے دو چیزیں رکھی ہوئی ہیں، ایک ہے علم اور دُوسرا ہے عمل، علم کے بغیر عمل کی کوئی اہمیّت نہیں اور عمل کے بغیر علم کی کوئی اہمیت نہیں۔ پیر ناصرِ خسروؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں اِس حکمت کو بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ عمل یعنی فعل کی مثال جسم ہے اور علم کی مثال رُوح ہے۔ اگرچہ عمل جسم کی طرح ہے اور علم رُوح کی طرح ہے لیکن پھر بھی دونوں کی اہمیّت اِس لئے ہے کہ جسم کے بغیر رُوح کی کوئی اہمیّت نہیں، رُوح کا کوئی کام نہیں بنتا ہے اور رُوح کے بغیر جسم بے کار ہے، مُردہ ہے یعنی زندگی کے دوران جتنی اہمیّت رُوح کی ہے اُتنی اہمیّت جسم کی ہے۔ دونوں کی اہمیّت برابر برابر ہے، قدر کی بات الگ ہے، اہمیّت کی بات الگ ہے۔ سر سر ہے، پاؤں پاؤں ہے لیکن اہمیّت دونوں کی ہے، پاؤں نہ ہو تو سر کیا کرے گا؟ سر نہ ہو تو پاؤں سے کیا بنے گا؟ اِسی طرح رُوح کا مرتبہ اگرچہ اعلیٰ ہے، جسم کا مرتبہ اگرچہ ادنیٰ ہے لیکن کام کے لئے اہمیّت دونوں کی ہے۔ بالکل اِسی طرح سے عمل بھی چاہئے اور علم بھی چاہئے اور اِسی سلسلے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ: ''اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ۚ'' (۳۵:۱۰)۔ قول یعنی علم، قول سے علم مراد ہے تو وہ قول جو پاک ہے یعنی پاکیزہ علم خدا کے حضور کی طرف بلند ہو جاتا ہے عالمِ بالا پر جانے کے لئے، لیکن یہ قول، یہ علم، یہ پاکیزہ حکمت از خود بلند نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اس کو عمل صالح یعنی نیک کام بلند کرتا ہے، تو مومنین کے علم کے لئے عمل کا بُراق چاہئے، عمل کا جہاز چاہئے۔ فعل یعنی عمل کے جہاز میں مومنین کا علم بلند ہو جاتا ہے اور بارگاہِ ایزدی تک یہ پہنچ سکتا ہے، اِس لئے علم اور عمل میں توازن کی ضرورت ہے، برابر برابر ہونے کی ضرورت ہے۔

اگر کوئی شخص صرف ایک پاؤں سے ورزش کرتا ہے اور دُوسرے پاؤں کو حرکت میں نہیں لاتا ہے، اُس کو ساکن رکھتا ہے، اُس پر دباؤ نہیں ڈالتا ہے تو ایسے شخص کی کیا پہلوانی ہو سکتی ہے یا وہ کھیل میں کیا کرتب دکھا سکتا ہے؟ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اپنے دونوں ٹانگوں کو، دونوں پاؤں کو ورزش کراتا، دونوں کو مضبوط کرتا اور دونوں کے اندر خون کی حرکت کو تیز کرتا یا اِس مثال کو ایک پرندے سے سمجھیں کہ کوئی پرندہ ہے کہ وہ ایک پَر سے اُڑنا چاہتا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک پرندہ اپنے ایک ہی پَر سے اپنا (balance) کو قائم رکھے اور وہ پرواز کر سکے جب تک کہ دونوں پَروں کو استعمال نہیں کرتا؟

بالکل اِسی طرح سے مومن کو عبادت بھی چاہیئے اور علم بھی چاہیئے۔ علم اور عبادت دونوں کی مدد سے مومن عالمِ بالا کی طرف پرواز کرسکتا ہے، تو یہ ہمیشہ خاطر میں رکھنا چاہیئے، جاننا چاہیئے کہ مومنین کو علم بھی چاہیئے اور عمل بھی چاہیئے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سا علم چاہیئے اور کس قسم کا عمل چاہیئے؟ اِس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ رضائے الٰہی جو ہو اُس کے مطابق۔ ویسے دُنیا کے اندر بہت سی باتیں ہیں جن کا نام لوگ علم رکھتے ہیں، وہ باتیں علم نہیں ہیں، علم وہ ہو جو حقیقی معنوں میں علم ہو، جو خدا کے حضور سے آیا ہوا ہو، جو امامؑ کے وسیلے سے ملتا ہو، وہ علم۔ آج آپ ذرا سوچ کر دیکھیں اِس وسیع و عریض دُنیا کے اندر کتنے لوگ ایسے ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے پاس علم ہے، آپ دُنیا کے کسی بھی گروہ کو لیں اِس مثال کے لئے اور دیکھیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ وہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہاں! ہر گروہ علم کا دعویٰ کرتا ہے اور کم سے کم تر لوگ بھی علم کا دعویٰ کرتے ہیں اور اُن کے پاس جو کتابیں ہیں اُن کے متعلّق اُن کا یہ خیال ہے کہ اُن کتابوں کے اندر علم کے خزانے ہیں حالانکہ آپ ایسی کتابوں کو اُٹھا کر دیکھیں، کچھ بھی نہیں یا تو اُس کے اندر کہانیاں ہیں، یا روایات ہیں، یا خُرافات ہیں، اور فضول باتیں ہیں کہ جن کو ایک مومن بچہ بھی نظر میں نہیں لاسکتا، ایسی باتوں کا نام لوگوں نے علم رکھا ہے۔ لوگ گمراہی کو ہدایت کہہ سکتے ہیں، جہالت کو علم بھی کہہ سکتے ہیں اور جو علم نہ ہو اُس کو علم قرار دے سکتے ہیں تو یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے اندر بہت سے لوگ بہک گئے ہیں اور گمراہ ہو گئے ہیں، تو بات دراصل یہ ہے کہ علم وہ ہو جو امامؑ کے حضور سے ملتا ہو اور عمل وہ ہو جو اُس کی خوشنودی کے مطابق ہو تو ایسے علم سے اور ایسے عمل سے مومن کو نجات مل سکتی ہے اور منزلِ مقصود کو وہ پہنچ سکتا ہے تو یہ ہمیشہ جاننے کی ضرورت ہے اور جب بھی کوئی اُمّت گمراہ ہوگئی اوّلین میں سے تو اُس کی وجہ کیا ہوئی؟ اُس کی وجہ یہ ہوئی کہ جو زمانے میں پیغمبر تشریف لائے اُس کی اطاعت سے اُن لوگوں نے سرتابی کی، انکار کیا، جیسے حضرت محمّد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں ہوا کہ بہت سے لوگوں نے یہ کہا کہ اُن کے پاس خدا کی ایک کتاب موجود ہے، اُن کے پاس ایک آسمانی شریعت موجود ہے، اُن کے پاس ایک قبلہ ہے، وہ ایک پیغمبر کے قائل ہیں اور اُن کا دین کامل و مکمّل ہے، اُن کے پاس علم بھی ہے، پھر کسی دُوسرے پیغمبر کے آنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہوسکتی ہے کہ یعنی وہ پیغمبرِ وقت کو نہ مانیں، اُس سے انکار کریں حالانکہ اُصول اُن کے سامنے یہ بنا ہوا ہے کہ وہ جس پیغمبر کی بھی بات کرتے ہیں وہ البتہ شروع کا پیغمبر نہیں ہے، وہ بعد کا کوئی پیغمبر ہے اور جب بعد کا پیغمبر ہے تو قانون یہ بنا ہوا ہے کہ یکے بعد دیگرے پیغمبر آتے رہے ہیں اور ہر آنے والے پیغمبر کو مانا گیا ہے یہ تو اُصول بن چکا ہے لیکن اِس اُصول سے وہ چشم پوشی کرتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں مثلاً یہود کو لیجیئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو مانتے ہیں اور اُن کے پاس تورات کتاب تھی لیکن موسیٰ علیہ السّلام اوّلین پیغمبر تو نہیں ہیں۔

اب سے پہلے کئی پیغمبر گزر چکے ہیں جیسے ابراہیمؑ اور اُن سے پہلے نوح علیہ السّلام اور اُن سے پہلے آدم علیہ السّلام تو وہ

یہ بھی جان چکے ہیں کہ بعض پہلے بھی ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ کچھ لوگ یہ کہہ کر گمراہ ہو گئے ہیں کہ اُن کے پاس ایک دین ہے، ایک کتاب ہے، وغیرہ لیکن پھر بھی جب کچھ لوگوں کی دشمنی ہوتی ہے پیغمبرِ زمان سے، ہادیٔ وقت سے، وہ بالکل اندھے ہو جاتے ہیں اور خدا کے نمائندے کو اور خدا کے خلیفہ کو نہیں مانتے ہیں، تو اِس سے یہ معلوم ہوا کہ علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں ہے بلکہ علم وہ ہے جو ہادیٔ زمان اپنی زبانِ مبارک سے بیان فرماتا ہے وہی علم ہے، تو روایات کے علم کی کوئی اہمیّت نہیں ہے اور ہاں! اگر روایات کا علم ہادیٔ زمان کی ہدایت کے ساتھ برابر ہے، اُس کے ساتھ موافق ہے تو بہت اچھی بات ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو اُس علم کی کوئی اہمیّت نہیں ہے، تو بڑے خوش نصیب ہیں اسمٰعیلی جو موجودہ وقت تک نورِ خداوندی کی پیروی کرتے ہیں اور اُس کی روشنی سے علم و ہدایت کو حاصل کرتے ہیں، اُس پر عمل کرتے ہیں اور عمل بھی وہ جو امامؑ کی ہدایات کے مطابق ہو تو اِنہی اعلیٰ چیزوں سے مومن کو نجات مل سکتی ہے، جو دُنیا کے کسی فرقے میں یہ خوبی نہیں ہے اور یہ سعادت بہت ہی عظیم ہے جو مومنوں کو نصیب ہوئی ہے، اِس کے لئے ہمیشہ مومن کو چاہئے کہ وہ باعمل ہو اور علم کی اہمیت کو سمجھے، علم کو عزیز رکھے اور علم کو چاہے، علم کی قدر کرے اور علم کی خدمت کرے۔

اِس کے بعد ایک اور مثال پیش کرنا مطلوب ہے وہ یہ کہ خدائے برتر و بزرگ نے اپنی پیاری کتاب میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور جن کے خرچے کو خدا قبول فرماتا ہے تو اُس کی مثال ایک دانۂ گندم کی طرح ہے جو کہ کسی اچھے کھیت میں بویا جاتا ہے تو اُسی فصل میں اُس کے سات خوشے ہوتے ہیں اور ہر خوشے میں سَو دانے ہوتے ہیں تو ایک ہی فصل میں ایک دانے کے سات سو دانے ہو جاتے ہیں (۲:۲۶۱)۔ اب اِس کا مقصد یہ ہے کہ یہ صرف صدقے کے لئے نہیں ہے، یہ صرف زکوٰۃ کے لئے نہیں ہے بلکہ اِس مثال سے ہم ہر نیکی کو، ہر اچھے کام کو، ہر خدمت کو سمجھ سکتے ہیں۔ آج الحمدللہ کہ آپ عزیزوں کی خدمت اُس دانۂ گندم کی طرح ہے، آپ کی قربانی، آپ کی خدمت اور آپ کا ہر خرچ اُس دانۂ گندم کی طرح ہے کہ یہ نیکی پھیل رہی ہے، کامیاب ہو رہی ہے اور پھیلتی جا رہی ہے، پھیلتی جا رہی ہے۔ خدا کی منظوری کی کوئی ظاہر میں علامت بھی ہونی چاہئے کہ مومن فرشتہ نہیں ہوتا ہے کہ اُس کو خدا کے حضور سے پتہ چلے کہ اُس کا کون سا کام قبول ہوا اور کون سی بات نامنظور ہوئی۔ مومن پر وحی نازل نہیں ہوتی ہے کہ جبرائیل کے وسیلے سے اُس کو پتہ چلے کہ خدا کا کیا منشاء ہے لیکن کچھ چیز تو ہونی چاہئے، ظاہر میں ہونی چاہئے، باطن تک مومن کی رسائی تو نہیں ہوتی ہے اور ظاہر میں یہ وسیلہ کیا کم ہے کہ جب مومن دیکھتا ہے کہ اُس کا کام آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے، اُس کے کام میں برکت پیدا ہو رہی ہے تو برکت کس کو کہتے ہیں؟ برکت کسی نیکی کے پھیلنے کو کہتے ہیں اور کسی نیکی میں اضافہ ہونے کو کہتے ہیں، تو کیا آپ نے جس خدمت کا آغاز کیا ہے اُس میں امامؑ نے برکت نہیں ڈالی ہے؟ اُس سے لوگوں کو فائدہ نہیں ہو رہا ہے؟ وہ نیکی پھیل نہیں رہی ہے؟ اُس میں لوگوں کو رُوحانی طور پر مسرّت و شادمانی اور خوشی نہیں ہے؟ اُس میں رُوح نہیں ہے؟ کیا وہ خدمت

تلواروں اور ہتھیاروں کی طرح نہیں ہے ایک لحاظ سے؟ پھر دُوسرے لحاظ سے کیا وہ خدمت غذاؤں کی طرح، خوراک کی طرح، (rationing) کی طرح نہیں ہے؟ اور پھر تیسری ایک مثال سے کیا وہ باغ لگانے کی طرح، پھول اُگانے کی طرح نہیں ہے؟ اور چوتھی مثال سے کیا دین کے قلعے کے گرد اگرد لشکر بٹھانے کی طرح نہیں ہے؟ ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک اور مثال سے کیا یہ خوشبو پھیلانے کی طرح نہیں ہے؟ عطر چھڑکانے کی طرح نہیں ہے؟ پھول بکھیرنے کی طرح نہیں ہے؟ موتی برسانے کی طرح نہیں ہے؟ کیا کچھ نہیں ہے، کیا یہ امامؑ کی عظیم عظیم مہمانی نہیں ہے کہ امامؑ کی مہمانیاں طرح طرح کی ہوتی ہیں اور جتنے مُرید ہیں وہ امامؑ کے بچے ہیں۔ امامؑ چاہتا ہے کہ امامؑ کے بچوں کی خدمت ہو، براہِ راست خدمت امامؑ کی کون نہیں کرے گا؟ سب امامؑ کے ظاہری درِ دولت کی خدمت کو چاہتے ہیں، اُس کی طرف بھاگنا چاہتے ہیں، امامؑ کے ظاہری حضور کی خدمت چاہتے ہیں، سب چاہتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ہیں جو دُور کی خدمت کرنا پسند کرتے ہیں، تو کیا امامؑ کا یہی منشاء ہے کہ سب لوگ امامؑ کی حضوری خدمت کو کریں؟ تو رُوحانیت میں بھی حضوری ہے، امامؑ کے پیچھے پڑے ہوئے یعنی امامؑ کے پسماندہ بچے جو بہت ہی پیچھے ہیں، جو علم میں غریب ہیں، جو رُوحانی غذا میں بھوکے ہیں، جو رُوحانیت کے لباس میں ننگے ہیں، جو دین کے مخالف کے سامنے زبان نہیں کھول سکتے ہیں، بول نہیں سکتے، بولنے کی جرأت نہیں ہے، ہمّت نہیں ہے اور جو اِس کے قریب ہیں کہ وہ گمراہ ہو کر چلے جائیں، جو اِس کے قریب ہیں کہ شیطان اپنے لشکر میں اُن کو شامل کر دے، کیا ایسوں کی خدمت کچھ کم اہمیّت رکھتی ہے؟ بہت بڑی اہمیّت رکھتی ہے، بہت بڑی اہمیّت رکھتی ہے، بہت بڑی اہمیّت رکھتی ہے۔

اِن شاءاللہ آپ کئی طرح سے جانتے ہیں اور بہت اعلیٰ خدمت کرتے ہیں تو روز بروز آپ کی اِس خدمت کی ترقّی ہوگی، یہ خوشبو اور زیادہ پھیلتی چلی جائے گی، یہ لہر بہت دُور تک دوڑ جائے گی اور یہ حلقہ، اور یہ (circle) بہت وسیع ہو جائے گا اور یہ عطر بہت دُور تک خوشبو دے گا اور یہ پھل جو ہے ایک دن بہت سے لوگ اِس کو پسند کریں گے، کھانے لگیں گے۔ بہرحال اِن شاءاللہ مولا کی قبولیت کی علامتیں ظاہر ہیں کہ یہ کام دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے اور مقبول ہوتا جاتا ہے تو اِس کے لئے آپ کی کوششیں قابلِ تعریف ہیں اور آپ خوش نصیب ہیں کہ اِس طرح کی خدمت کیا کرتے ہیں اور بہت اہم علم کو محفوظ کرتے ہیں، یہ تو میں نے حال کی بات کی اور اِن شاءاللہ مستقبل میں بھی آپ کی جو خدمت ہے وہ قائم و دائم رہے گی اور آنے والی نسل بھی اِس سے اِن شاءاللہ فائدہ اُٹھائے گی، تو آپ اپنے طور سے دُعا مانگیں کہ مولا آپ کو اِس میدان میں اور ترقّی عنایت فرمائے [آمین] آپ کو زیادہ سے زیادہ اولو العزمی عنایت ہو [آمین] بلند حوصلہ گی عطا ہو [آمین] اور آپ راہِ مستقیم پر ثابت قدمی سے آگے آگے بڑھ سکیں [آمین] اور آپ نیک ارادوں میں کامیاب ہو جائیں [آمین]، آپ پر مولا بہت بہت مہربان ہو [آمین]، آپ کے دل کی جملہ مُرادیں پوری ہو جائیں [آمین] ساری

مشکلات آسان ہوں[آمین] اور مشرق و مغرب میں جتنے بھی مومنین ہیں اُن سب کی مشکلات کو خداوند آسان کر دے [آمین] مومنین کو تمام بلاؤں سے محفوظ رکھے[آمین] اور مومنین پر مولا بہت مہربان ہو[آمین] اُن سے راضی ہو[آمین] اُن کی تمام نیکیوں کو قبول فرمائے[آمین] اور اُن کو علم میں، عمل میں بہت زیادہ ترقّی دے [آمین] اور خداوند جملہ جماعت کو جو اِس سیارۂ زمین پر بستی ہے دیدارِ ظاہر اور دیدارِ باطن کی فضیلت سے نوازے۔

آمین، یاربّ العالمین۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: ثناوزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: ذکر وفکر

کیسٹ نمبر: ۶۷ تاریخ: ۱۱، فروری ۱۹۸۲ء کراچی

Click here for Audio

مومن کے اندر بہت سی قوتیں ہیں، بہت سی صلاحیتیں ہیں اور مومن کو خدا نے عبادت و بندگی کے لئے، گریہ وزاری کے لئے، گڑگڑانے کے لئے، دُعا مانگنے کے لئے پیدا کیا ہے اور بندۂ مومن کی عبادت خدا کے حضور میں بہت ہی پسندیدہ ہے، بہت ہی عزیز ہے اور بڑی قدردانی ہوتی ہے۔ اِس لئے کہ فرشتے کے لئے کچھ مجبوریاں نہیں ہیں، وہ تو عبادت کے لئے (automatic) ہے اور عبادت خود بخود ہوتی رہتی ہے اور وہ عبادت رُکتی نہیں، ہمیشہ جاری وساری رہتی ہے، ذکر ہمیشہ چلتا رہتا ہے اور ذکر کا سلسلہ فرشتے میں کبھی ٹوٹتا نہیں ہے، لیکن بندے کو دیکھیں تو صحیح کہ یہ کتنی مجبوریوں کے درمیان رہتا ہے کہ اِس کے سامنے کیسے کیسے امتحانات ہیں اور کتنی آزمائشیں ہیں۔ اِن تمام کے باوجود اگر بندۂ مومن عبادت میں مصروف ہوتا ہے اور خدا کو یاد کرتا ہے یہ اِس کی بہت بڑی سعادت مندی ہے، تو اِس لئے مومن کو چاہیئے کہ ہر حالت میں اپنے پروردگار کو یاد کرے، راحت ہے یا تکلیف ہے، آسائش ہے یا دکھ ہے، کچھ بھی ہو تو ہر حالت میں خداوند کو یاد کرنا مومن پر فرض ہے کہ اگر خوشی اور راحت ہے تو خوشی سے اور راحت سے خدا کو یاد کرے اور اگر تکلیف ہے تو تکلیف کے بہانے سے بھی وہ اپنے پروردگار کو، اپنے ربّ کو، اپنے آقا و مالک کو یاد کرسکتا ہے اور یاد رہے کہ کثرت سے ذکر ہونا چاہیئے یعنی ہمیشہ خداوندِ عالم کو یاد کیا جائے مختلف صورتوں میں، مختلف سطحوں پر اور مختلف حیثیتوں میں ربّ کو یاد کیا جائے، ربِّ کریم کو یاد کیا جائے، کہ ربِّ کریم کی یاد بہت ہی شیرین ہے، بہت ہی لذیذ ہے اور وہ حلاوتوں سے لذّتوں سے بھرپور ہے، تو مومن کی رُوح کے لئے اُس میں بہت سی خوشبوئیں ہیں، بہت سی اُس میں مسرتیں ہیں، شادمانیاں ہیں۔ اِس کے لئے مومن کو چاہیئے کہ اپنی زبان پر اور دل میں ذکرِ خدا کو جاری وساری رکھے۔ ذکرِ خدا ایک روشن چراغ کی مثال ہے، کہ دل کے مکان کے اندر یادِ الٰہی کے چراغ کو فروزان کرنا چاہیئے، جلا کے، روشن کر کے رکھنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ دل کے کمرے میں تاریکی ہو اور پھر اُس تاریکی سے فائدہ اُٹھا کے کوئی چور یعنی شیطان دل میں آجائے اور جب دل کے اندر امام کی، یادِ الٰہی کی روشنی ہوگی تو مجال ہے کہ اُس میں کوئی شیطان گھسے۔

جس طرح کے جنگل کی بابت آپ جانتے ہیں کہ جہاں جانور ہوتے ہیں، درندے ہوتے ہیں تو اُس کے لئے

وہاں آگ روشن کی جاتی ہے، آگ جلائی جاتی ہے اور جس کے نتیجے میں جو چیتے ہیں یا جو شیر وغیرہ چیڑ پھاڑ نے والے جانور ہیں وہ اِس روشنی کی طرف نہیں آسکتے ہیں۔ اِسی طرح یہ ایک اچھی مثال ہے کہ دل کے مکان کے اندر معرفت اور یادِ الٰہی کا چراغ روشن ہو تو اُس میں کوئی وسوسہ نہیں آنے پائے گا اور یاد رہے، کہ شیطان کا سب سے پہلا حملہ جو ہے وہ ذکر کو بھلانے کی حیثیت میں ہے یعنی شیطان مومن کو بہکانے کے لئے کیا تدبیر کرتا ہے، کیا صورت اختیار کرتا ہے؟ وہ سب سے پہلے ذکر پر حملہ کرتا ہے یعنی ایسی صورت پیدا کرتا ہے کہ جس سے مومن ذکر کو یعنی یادِ الٰہی کو فراموش کر بیٹھے۔ اِس مطلب کو قرآن میں بڑے خوبصورت الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے، وہاں تو لغزش کے لفظ میں ہے تو: ''فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ'' (۳۶:۲) شیطان نے آدم وحوّا کو کس طرح بہکایا تھا، آپ کو معلوم ہے؟ شیطان نے آدم وحوّا کے قدموں کو پھسلایا تھا یعنی اُس نے ایک ایسی حالت پیدا کر دی تھی کہ جس سے آدم وحوّا کے پائے استقامت میں لغزش آئی، اُن کے قدم ڈگمگائے گئے، پھسل گئے یعنی ذکر میں وقفہ پڑ گیا، تعطل ہوا اور پھر اِسی سے شیطان آگے بڑھ سکا۔

چنانچہ جو ہوشمند مومن ہے وہ جانتا ہے کہ ذکر یعنی یادِ الٰہی اُس کے پاس ایک ہتھیار کی حیثیت سے ہے جو شیطان کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے تو اِس ہتھیار کو، اِس حربے کو یعنی ذکر کو، یادِ الٰہی کو، مولا کے پاک نام کو بڑے پیار سے بڑی حفاظت سے اور بڑی اُمیدوں سے رکھنا چاہیئے، کہ جس طرح دُنیا کے اندر کوئی شخص اپنے پاس ہتھیار رکھتا ہے، کوئی شکاری یا کوئی دُوسرا شخص جو ہتھیار اپنی جان کی حفاظت کی غرض سے رکھتا ہے تو ایسے میں وہ شخص ہتھیار کو بڑی حفاظت سے رکھتا ہے اور اُس شخص کو وہ ہتھیار بڑا اعزیز ہوتا ہے یا کسی سپاہی کو لیجیئے کہ سپاہی کے نظام یا کہ قانون کے مطابق جو ہتھیار ہوتا ہے وہ اُس کی جان کے برابر ہوتا ہے کیونکہ اُس کی جان کی سلامتی، ملک کی سلامتی، فوج کی سلامتی اِس میں ہے کہ وہ اپنے ہتھیار کو سنبھالے اور اُس کو محفوظ رکھے اور فوج کے قانون کے لحاظ سے ہتھیار سے غفلت برتنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے اور اگر اتفاق سے کسی نے ہتھیار کی دُرست حفاظت نہیں کی، تو اُس کو بڑی سے بڑی سزا مل جاتی ہے تو یہ بہت اچھی مثال ہے۔

اِسی طرح مومن کی ذات میں جو یادِ الٰہی ہے وہ ہتھیار ہے جو شیاطین کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے جس میں کہ اُس کے ایمان کی اور رُوح کی، دین کی اور اُس کے قلعۂ دین کی سلامتی ہے، لہٰذا ہوشمند مومن کو چاہیئے کہ وہ اِس مثال کو سمجھے اور اِس ہتھیار کو جان سے زیادہ عزیز رکھے، اور ہر وقت نامِ خدا کو زبان پر اور دل میں جاری وساری رکھے کیونکہ اگر مومن تھوڑی یاد کرتا ہے یا زیادہ یاد کرتا ہے تو خداوندِ عالم جو مہربان ہے مومن پر اُس کی یاد میں سے ایک ذرّے کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتا بلکہ خداوند اُس کے ہر ہر لفظ کے پیچھے کئی کئی فضیلتیں اور کئی کئی ثواب عطا فرماتا ہے۔ اِس کے لئے پُر امید ہو کر خداوند کے نام کو لیا جائے اور اگر خوش بختی سے مومن کی عادت ایسی ہو، کہ وہ دن بھر خداوند کو یاد کرتا ہے تو کتنی ہی اچھی بات ہوگی۔ اگر عادت ایسی ہو کہ کام کاج کے درمیان بھی مومن نامِ خدا کو لیتا ہے تو یہ بہت ہی اچھی عادت ہے اور اِس میں بہت بڑی

حکمت ہے۔ چنانچہ بہت سے مومنین ایسے ہیں، ہم نے اپنے اِس دُور و دراز سفر اور اِن دَوروں کے دوران دیکھا ہے بہت سے مومنین کو، بہت سے گھروں کو دیکھا ہے اور بہت سے گھروں کے افراد کو دیکھا ہے اور کچھ اگلے زمانے کے لوگوں کو بھی دیکھا ہے اور اِس مشاہدے میں میرے سامنے کئی اچھی مثالیں آئیں ہیں وہ یہ، کہ بہت سے مومن مرد اور مومنہ عورتیں ہوا کرتیں تھیں اور اب بھی ہیں، کہ وہ ہر مقام پر اور ہر موقع پر خداوند کے نام کو لیتے ہیں اور اِس میں کیا بتاؤں گویا کہ کسی گھر میں جب خدا کے نام کو گاہ بیگاہ لیا جاتا ہے تو اُس سے گویا کہ ایک قسم کی روشنی پھیل جاتی ہے یا یہ، کہ اُس سے ایک قسم کی خوشبو پھیل جاتی ہے اور گھر کے اندر جتنے افراد ہیں وہ جب سنتے ہیں نامِ خدا کو تو اُن کو ایک فیض ملتا ہے، اُن کو ایک برکت ملتی ہے۔

مجھے یاد ہے جب میں بہت ہی چھوٹا تھا تو اُس زمانے میں بہت سے لوگ ایسے تھے کہ وہ بار بار خداوند کو یاد کرتے تھے اور رات کو اگر سوئے ہوئے ہیں تو ہر کروٹ کے بدلتے ہوئے اور ہر بار جب وہ جاگتے تھے اُس وقت وہ خدا کو یاد کرتے تھے، مولا کو یاد کرتے تھے۔ اِس سے بہت اچھا تاثر ملتا تھا جو اِن کے قرب و جوار میں لوگ ہوتے تھے اور بہت اچھی تعلیم ملتی تھی اور آئندہ نسل پر اِس کی ایک اچھی روشنی پڑتی تھی اور اِس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ جب اُٹھتے تھے تو خداوند کو یاد کرتے تھے، جب بیٹھتے تھے تب مولا کا نام لیتے تھے، جب کھاتے پیتے تھے، جب سوتے جاگتے تھے، جب چلتے اور پھرتے تھے، جب وہ آرام کرتے تھے، تو اُس میں کسی بھی حالت میں خداوند کے نام کو فروگزاشت نہیں کرتے تھے، ترک نہیں کرتے تھے تو ہر وقت اپنے خداوند کو پکارتے تھے، پھر کیا ہوتا تھا کہ ایسے مومنین جو ہیں آہستہ آہستہ آہستہ گویا کہ مٹّی سے سونا بن جاتے تھے اور اب بھی ایسے مومنین گھروں میں ہیں۔ ہم نے اِس کراچی کے اندر بھی بہت سے افراد کو دیکھا ہے، کہ ذرا بھی وہ کام کاج سے فارغ ہو گئے تو اُنہوں نے جائے نماز یا ایسی کوئی چیز بچھائی یا صوفے پر بیٹھے بٹھائے اُنہوں نے ہاتھ میں تسبیح لی تو وظیفہ پڑھنے لگے، مولا کو یاد کرنے لگے تو ایسے افراد بھی ہیں، ایسے بھائی ہیں، ایسی مائیں ہیں، ایسی بہنیں ہیں، ایسی بیٹیاں ہیں اور ایسے اسمٰعیلی ہیں جن کو خداوند کے نام سے بے حد دلچسپی ہے، تو اِس طرح کرتے کرتے کوئی مومن دائم الذّکر ہو سکتا ہے۔

دائم الذّکر ایک صفت ہے، دائم الذّکر گویا ایک رُوحانی ٹائٹل ہے۔ دائم الذّکر ایک بہت بڑی صفت ہے اور اِس کا مطلب ہے کہ کوئی بندہ ایسا بن جائے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ خدا کو یاد کر سکے تو پھر ایسے بندۂ مومن کے لئے صبح کے وقت کیا مشکل ہے، کہ وہ جاگے اور صحیح طور سے بیٹھے اور پھر ذکر میں آگے بڑھے؟ اُس کے لئے بہت آسانی ہو جاتی ہے، تو جو بھی دائم الذّکر ہو جائے گا اُس کے لئے ہر بات آسان ہو جائے گی اور بہت ساری مشکلات سے بچا رہے گا اور بہت ساری بلاؤں سے، آفتوں سے وہ محفوظ رہے گا اور اُس کی عبادت، ذکر بہت آگے بڑھے گا۔ اُس کی ہر بات میں مٹھاس اور شیرینی ہو گی، تو یہ مومن کی صفات میں سے ہیں۔ آپ بھی مومن کی صفات کو اپنا موضوع بنائیں اور فرامین اقدس سے، کتابوں سے

مواد کو جمع کر کے دیکھیں کہ مومن کی کیا صفات ہیں؟ مومن کی خوبیاں کیا ہیں؟ مومن کے اوصاف کیا ہیں؟ اور خداوندِ عالم قرآن میں مومن کے بارے میں کیا فرماتا ہے اور دین کی کتابوں میں مومن کے بارے میں کیا کہا گیا ہے یا حدیثوں میں مومن کی شان میں کیا فرمایا گیا ہے، تو آپ اُن چیزوں کو بھی سامنے رکھیں تا کہ زیادہ سے زیادہ دلچسپی ہو، حوصلہ ملے، ہمّت بلند ہو جائے اور آگے بڑھنے کے لئے شوق ذوق پیدا ہو جائے کیونکہ ہر کسی کا کوئی نصب العین ہوتا ہے۔ نصب العین کا مطلب پروگرام بھی ہوسکتا ہے اور نصب العین جو ہے یعنی ایک جس طرح کہ کوئی (figure) کہیں یا کوئی نشان کہیں یا کسی کو پہاڑ کی چوٹی پر جانا ہے، تو وہ پہلے سے تعیّن کرتا ہے کہ اُس کو کہاں تک جانا ہے تو یہ نصب العین ہے تو مومن کا جو نصب العین ہے، مومن کا جو منصوبہ ہے، مومن کا جو (target) ہے، اِس نصب العین کو ہم (target) بھی کہہ سکتے ہیں تو وہ بہت بلند ہے اور اِس کا تعیّن اُس وقت ہوسکتا ہے، کہ یہ مومن، مومن کے اوصاف کو جانے، قرآن سے، حدیث سے، کتابوں سے، فرامین سے کہ مومن کی کیا صفت ہونی چاہئے تا کہ اُس کے پاس ایک معیار قائم ہو، ایک کسوٹی ہو اور اِس کسوٹی سے خود کو پرکھے، دیکھے کہ مومن کی صفات میں سے اِس کے پاس کیا کیا باتیں ہیں اور کیا کیا کمی ہے، تو اِس کو پتہ چل جائے گا، پھر اِس کو احساس ہوگا اور اپنی خامی کو، کمی کو دُور کرنے کے لئے کوشش کرے گا، لہٰذا دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ مومن کو مومن کے اوصاف اور مومن کی صفات اور مومن کی خوبیوں سے متعلق جو موضوع ہے اُس کو بھی سُننا چاہئے، اُس کو بھی پڑھنا چاہئے۔

بڑا مزہ آئے گا، بڑا مزہ آئے گا کہ اگر مومن جو ہے مومن کے اِس اوصاف کو پڑھے، سُنے اور مومن کا جو (target) ہے وہ بہت ہی بلند ہے، مومن کا جو نصب العین ہے وہ بہت آگے دُور ہے، بہت بلند ہے۔ اِس لئے کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''مومن کی نگاہ بلندی کی طرف ہونی چاہئے'' [راجکوٹ، ۲۱۔ ۱۰۔ ۱۹۰۳ء] یعنی اُس کا پروگرام یا کہ لائحۂ عمل ایسا ہونا چاہئے کہ وہ سمجھے کہ اُس کو کہاں تک جانا ہے۔ قرآن کے اندر بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جن کے اندر پیغمبر، امامؑ اور مومنین کا ایک ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے۔ دیکھیں ایسے ارشادات بھی ہیں قرآن کے اندر کہ خداوندِ عالم نے، اگرچہ پیغمبر کی شان بہت بلند ہے اور امام اقدّس واطہر بہت عالی ہیں لیکن پھر بھی ایک طرح سے دیکھا جائے تو لفظِ مومن میں مُرید بھی پیغمبر اور امامؑ کے ساتھ ہے۔ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر قرآن کے اندر جہاں فرمایا جاتا ہے: ''یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا'' یعنی یہ سب کچھ جو دُنیا بسانے کا اہتمام کیا گیا ہے اِس کا مقصد جو ہے وہ مومنین کی رہنمائی ہے، مومنین ہی وہ لوگ ہیں جو درمیان میں ہیں، درمیان میں ہیں یعنی دُنیا میں جو انکار والے ہیں اُن کو اِس دُنیا کی زندگی سے کوئی فائدہ نہیں ہے، جو ہم سے اُوپر ہیں اُن کے لئے کسی چیز کی حاجت نہیں ہے۔ رہے درمیان والے جو مومنین ہیں تو یہ ساری کائنات اور یہ سب کچھ نظام، انبیاء کا دُنیا میں آنا اور ائمّہ کا دُنیا میں موجود ہونا یہ سب کچھ مومنین ہی کی خاطر سے ہے مثلاً قرآن سے فائدہ کن کو ہے؟ پیغمبر کو ہے؟ پیغمبر تو پاک ہیں، امامؑ پاک ہیں، پھر کیا قرآن سے فائدہ اہلِ انکار کو ہے؟ نہیں! نہیں!! وہ تو منکر ہیں، پھر قرآن سے فائدہ

کس کو ہے؟ مومن کو ہے، پیغمبر اور امامؑ سے فائدہ کس کو ہے؟ مومن کو ہے، پھر دُنیا میں جو کچھ ہے وہ مومنین ہی کے لئے ہے۔ دوسری بات یہ کہ پیغمبر اور امامؑ کے ناموں میں سے ایک نام ہادی ہے۔ ہادی کا مطلب کیا(guide)، رہنما، راستہ بتلانے والا اور مُرید کیا ہیں؟ وہ پیرو ہیں، پیرو کا کیا مطلب؟ پیچھے پیچھے چلنے والے، اب آپ ہی بتائیں کہ اِس پیروی میں، اِس پیچھے چلنے میں جو آخری منزل ہے وہ کہاں ہے؟ یعنی یہ رہنمائی یا یہ (guidance) کہاں تک ہونی چاہئے؟ آخری منزل تک تو فرق یہ ہے، کہ پیغمبر آگے آگے ہیں، امامؑ آگے آگے ہیں اور پیرو جو ہیں پیچھے چلنے والے پیچھے پیچھے ہیں۔ وہی راستہ اور وہی منازل، وہی مراحل اور وہی منزلِ آخرین جو (destination) ہے، جو منزلِ مقصود ہے، تو وہی ہے یعنی بندوں کو خدا سے ملا دینا یہ پیغمبر اور امامؑ کا کام ہے۔

یہ سوال الگ ہے کہ وہاں پر کون ہیں، مونور یا لزم ہے یا ایک خدا ہے یا پیغمبر اور امامؑ ہے، انسانِ کامل ہے، یہ موضوع ہی الگ ہے۔ آپ اِس کو الگ رکھیں، ہر چیز کو نہ ملائیں۔ اگر ہم صرف یہ بات کرتے ہیں کہ جو مُرید ہے وہ اپنے مرشد کے پیچھے پیچھے کہاں تک جاتا ہے؟ تو مرشد مُرید کو کسی ایک منزل پہ رکھنا نہیں چاہتا ہے، یہ قانون نہیں ہے، یہ رہنمائی، یہ ہدایت آخری منزل تک پہنچتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے اندر جن جن آیات میں خدا نے قرآن میں، مومنین کو پیغمبر اور امامؑ کے ساتھ لیا ہے وہ صحیح ہے جیسے لفظِ مومن ایک ٹائیٹل ہے، مشترک ہے پیغمبر، امامؑ اور دیگر مومنین کے درمیان، یہ ایسا نہیں ہے کہ اِس کا اطلاق مُرید پر ہوتا ہے، ایسا بھی نہیں ہے کہ تنہا پیغمبر پر اِس کا اطلاق ہوتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ لفظِ مومن صرف امامؑ کے لئے استعمال ہوتا ہے بلکہ یہ استعمال ہوتا ہے پیغمبر، امامؑ اور دیگر مومنین یعنی مُریدوں کے لئے۔ مثلاً حدیث میں یہ ارشاد کہ خدائے رحمان آسمان میں سموتا نہیں ہے، وہ زمین میں سموتا نہیں ہے، وہ بندۂ مومن کے قلب میں یعنی دل میں سمو جاتا ہے، [لَا یَسَعُنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَیَسَعُنِیْ قَلْبُ عَبْدِیَ الْمُؤْمِنِ التَّقِیِ] تو سوال پیدا ہوتا ہے، کہ اِس سے کون سا مومن مراد ہے جس کے دل میں خدا سمو جاتا ہے؟ سب سے پہلے پیغمبر، امامؑ اور سب مومن قدر بقدر، درجہ بدرجہ۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن میں جب خدائے پاک و برتر سب مومنین کو پیغمبر اور امام کے ساتھ لیتا ہے تو یہ بہت بڑی سعادت ہے، بہت بڑی سعادت ہے، اور یہ اِس لئے ہے کہ مومن سوچے، کہ اُس کا بلند ترین مقام کون سا ہے، بلند ترین مقام کا اندازہ اِس طرح سے ہو سکتا ہے پیغمبر کی (position) سے، اُس کی مرتبت سے، امامؑ کی رُوحانیت سے، امامؑ کے مرتبے سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہم اِس کے بعد یہ کیوں نہ کہیں کہ پیغمبر اور امامؑ کیا ہیں، پیغمبر اور امامؑ انسان کی ترقّی یافتہ صورت ہیں، انسان کے اُونچے مقام پر پیغمبر اور امام کھڑے ہیں۔ کیا پیغمبر نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ: [اَنَا وَ اَنْتَ یَا عَلِیُّ اَبَوَا الْمُؤْمِنِیْنَ] یا علیؑ! میں اور آپ مومنین کے رُوحانی والدین ہیں۔ یہ حدیث آپ کو کئی کتابوں میں مل سکتی ہے اور وجہِ دین میں کافی تشریح اور وضاحت کے ساتھ یہ مذکور ہے [وجہ دین جلد دوئم: ۳۴۱، ۳۹۵] تو اب ہم

ٹھہر کے سوال کریں گے، کہ اگر پیغمبر اور امامؑ ہمارے رُوحانی ماں باپ ہیں تو اِس کی کیا منطق بنتی ہے؟ منطق تو میرے نزدیک یہ بنتی ہے کہ اولاد اگر نااہل ہو تو وہ بات الگ ہے، اور اگر اولاد لائق ہے، فرمانبردار ہے، تو اُس کو ضرور اپنے ماں باپ کے مرتبے کو پہنچنا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا پیغمبر نے ایسا نہیں سوچا تھا کہ جو مومنین ہیں وہ ایسا نتیجہ بھی نکالیں گے اور اِس طرح سے بھی سوچیں گے؟ تو پیغمبر سب کچھ جانتے تھے اور یہ بات صحیح ہے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ خدا نے جس طرح ایک آیت میں اور ایک ہی (category) میں جو پیغمبر، امامؑ اور مومنین کو لیا ہے اِس میں بڑا راز ہے، بہت ترقّی کا راز ہے۔ ایک طرح سے اِس میں توجّہ دلائی گئی ہے کہ مومنین خیال رکھیں کہ اُن کا اُونچا مرتبہ کون سا ہے اور پھر اِسی کے ساتھ ساتھ اُن پر کون سے فرائض عائد ہو جاتے ہیں، اُن کا بھی اشارہ ہے، تو اب اِس وقت بھی امامؑ ہر فرمان میں فرماتے ہیں کہ: ''تم میرے پیارے روحانی فرزند ہو'' یا اِس جیسا دوسرا کوئی ارشاد، تو ہر حالت میں بہت سے فرامین سے یہ مفہوم ملتا ہے کہ امامؑ کے نزدیک پسندیدہ جو لفظ ہے اور جو امامؑ کے نزدیک مُریدوں کو زیادہ سے زیادہ خوشی دِلانے والی جو بات ہے وہ یہی ہے کہ امامؑ جب بھی خطاب فرماتے ہیں مُریدوں سے کہتے ہیں کہ میرے پیارے رُوحانی بچّوں۔ آپ ہی تشریح کریں، کہ اِس ''پیارے'' کا کیا مطلب ہے اور ''فرزند'' کے کیا معنی ہیں اور اگر ''پیارے'' نہ فرماتا تو فرزند کہتا تو یہ ایک (common) اور عام لفظ ہو سکتا، تو جب فرماتا ہے کہ ''پیارے'' تو اِس ''فرزند'' کو خصوصیت ملتی ہے، یہ عام سے خاص ہو جاتا ہے اور پھر ''پیارے'' میں بہت معنی ہیں۔ میں تشریح کے ایک دو الفاظ بتاؤں کہ ''پیارے'' کا کیا مطلب ہوتا ہے یعنی امام کو جو پیارا ہوتا ہے تو یہاں بخشنے کے معنی بھی ہیں، عفو کے معنی بھی ہیں، توحید یعنی کہ ملنے کے معنی بھی ہیں، مہربان ہو جانے کے معنی بھی ہیں اور ہمارے لئے بہت کچھ کرنے کے معنی بھی ہیں۔ اگر کوئی دُنیوی باپ اپنے بچّوں کو کہتا ہے پیارے بچّوں اور وہ سچ کہتا ہے، دل سے کہتا ہے تو ظاہری بات ہے کہ وہ اپنے بچّوں کو بہت چاہتا ہے اور بہت کچھ کرنا چاہتا ہے، یہ تو ایک عام انسان کی بات ہوئی۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اُس باپ کے پاس جو کچھ بھی ہے تو وہ اپنے بچّوں پر قربان، دولت ہے، جائیداد ہے، مال ملکیت ہے، گھر بار ہے، کچھ بھی ہے، تو اگر باپ بچّوں کو پیار کرتا ہے، پیار دیتا ہے تو باپ کی ہر چیز بچّوں پر قربان ہے، ایسا ہے؟ ضرور۔ اب تو یہ ایک عام انسان کی حد کی بات ہوئی۔ اِس سے آگے بڑھ کر امامؑ کے اِس پُرحکمت فرمان کو لیجئے جس میں وہ بار بار فرماتے ہیں کہ ''میرے بہت ہی عزیز بچّوں!'' اور بعض دفعہ مولا "my most beloved children" فرماتے ہیں۔ میرے محبوب بچّوں، اگر اِس کا ترجمہ اِس طرح سے کریں تو غلط نہیں ہوگا یعنی میرے پسندیدہ اور میرے پیارے محبوب بچّوں۔

اِس میں یہ ہے کہ جن کو یہ پیار ملنا چاہئے اور جو اِس کے اہل ہیں اور جو اِس درجے میں ہیں، اِس کی قابلیت رکھتے ہیں تو اُن کو بڑا مبارک ہے، اُس کے اندر بہت بشارت اور بہت خوشخبری ہے۔ نجات کی ضمانت ہے اور بخشش کی ضمانت

ہے اور امامؑ کے درجے سے جو کچھ ہوسکتا ہے وہ سب کچھ کرنے کے معنی ہیں۔ اِس کے لئے میں نے ایسے کہا تھا کہ انسانِ کامل، دیکھیں یہ جو اصطلاح ہے یہ تصوّف کا ہے، انسانِ کامل یعنی اسمٰعیلی جو ہیں وہ اہلِ حقیقت ہیں اور صوفی لوگ جو ہیں اور اہلِ طریقت ہیں، ایک منزل پیچھے ہیں۔ پھر بھی بہت سی باتیں ہم مثال کے طور پر تصوّف کی منزل سے، تصوف کے مقام سے لیتے ہیں، تو صوفیوں نے یہ اصطلاح بنائی، بڑی اچھی اصطلاح ہے، انسانِ کامل۔ انسانِ کامل کا کیا مطلب؟ انسانِ کامل یعنی وہ انسان جو صحیح معنوں میں انسان ہے، وہ انسان جو صحیح معنوں میں انسان ہے، جو کامل اور مکمّل ہے اور اُس میں کوئی کمی نہیں ہے اور انسان کو جو کچھ ہونا چاہئے، جیسا ہونا چاہئے ایسا انسان۔ پھر بھی جیسا چاہئے نہیں ہے تاہم یہ اصطلاح بہت اچھی ہے۔ اب اِس کے (opposite) میں ایک یعنی (result) یا کہ ایک معنی کا تعیّن ہوتا ہے کہ اگر ایک انسانِ کامل ہے تو پھر دوسرے سب انسانِ ناقص ہیں۔

کامل، ناقص۔ کامل معنی مکمل (complete) اور ناقص معنی کم، کم تر، نارسیدہ، کچّا، خام، ناتمام جس طرح کوئی پھل ہے تو وہ پہنچا ہوا پھل ہے، پختہ ہے، پکّا ہے، اُس کے اندر جو کچھ ہونا چاہئے خوبی، ذائقہ، مغز، رنگ، بوسب کچھ مکمّل ہے اور ایک اُس کے مقابلے میں دوسرا پھل ہے جو نارسیدہ ہے، ناتوان ہے، کچّا ہے، اُس کے اندر مغز جو ہے وہ مکمّل نہیں ہے اور جو گودا ہے، جو گٹھلی ہے، جو خوبی ہے اور جو خوشبو ہونی چاہئے، جو رنگ ہونا چاہئے، جو ذائقہ یعنی مزہ ہونا چاہئے، کچھ نہیں ہے۔ کتنا فرق ہے ایک کچّا پھل جو ضخامت کے لحاظ سے بھی چھوٹا ہے اور لذّت میں بھی کم تر ہے، ایک پختہ پھل جو اپنے مقام کو پہنچا ہوا ہے، تو انسانِ کامل اور پھر اِس کے مقابلے میں انسانِ ناقص، انسانِ ناقص ہے یہ فرق ہے۔ مگر اِس فرق کے باوجود ایک خام و ناتمام پھل جو ہے وہ پختہ ہوسکتا ہے بشرطیکہ کوئی اُس کے لئے بیماری نہ ہو، کوئی آسمانی یا زمینی بلا اُس میں نہ لگے، ارضی و سماوی بلا جسے کہتے ہیں، تو اگر ایسی کوئی بات نہ ہو، تکلیف نہ ہو، بیماری نہ ہو، کوئی رُکاوٹ نہ ہو، تو یہ پھل جو ہے پختہ ہوسکتا ہے جو اب کچّا ہے۔ خیر پھل کو تو کچھ اختیار حاصل نہیں ہے مگر انسان جو ناقص ہے اُس میں کچھ صلاحیت بھی ہے، کچھ اختیار بھی ہے، کچھ اُس پر فرائض نہیں ہیں، تو یہ جو ناقص ہے وہ کامل کی پیروی کرتے کرتے کامل بن سکتا ہے، کامل بن سکتا ہے، مگر اُس کی شرط یہ ہے کہ وہ کامل کی پیروی کرے، کامل کی پیروی کرے اور کامل میں فنا ہوجائے تو کامل اِس کو رُوح دے سکتا ہے۔ مومن کے اوصاف کی بات نکلی تھی کہ مومن کے جو اوصاف ہیں وہ سامنے رکھیں تو بہت اچھی بات ہے، حوصلہ مل سکتا ہے اور مومن سمجھ سکتا ہے کہ اُس کی رسائی حقیقت میں کہاں تک ممکن ہے، کون سی بات ممکن ہے اور کون سی بات ناممکن ہے، اِس کے لئے مومن کے جو اوصاف ہیں وہ بہت ہی ضروری ہیں، تو عزیزانِ من! یہ چند باتیں تھیں جو جیسے ذہن میں آئیں تو میں نے آپ کے سامنے پیش کی۔ اب اگر آپ کوئی متعلّقہ سوال سامنے رکھنا چاہتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ اُس سوال کے جواب میں یا سوال میں یا دونوں میں دلچسپی ہو۔ شکریہ!

سوال: ہاں! اِنہوں نے ایک سوال یہ پیش کیا کہ ایک مومن ہے، اُس نے بول نہیں لیا ہے، اُس کے پاس اسمِ اعظم نہیں ہے لیکن وہ اپنی طرف سے بہت کوشان ہے، کوشش کرتا ہے، عبادت و بندگی کرتا ہے، خدا کے کسی بھی اسم کو پڑھتا رہتا ہے یعنی وہ عبادت گزار ہے اور بڑا اچھا مومن ہے، تو ایسے مومن کے متعلّق کیا خیال ہے یا اُس کو کیا ملے گا؟ آیا اُس کی کچھ ترقّی ہوگی یا یہ کہ اُس کو ہر حالت میں اور ہر قیمت پر اسمِ اعظم لینا چاہئے؟ یہ اِن کا سوال ہے۔

جواب: اِس کے لئے جواب یوں عرض ہے کہ ضرور اِس کو ترقّی ملنی چاہئے اور ملے گی۔ ترقّی ملے گی اور دین میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس میں حرج ہو اور جب وہ مومن ہے اور امامؑ کی پیروی کرتا ہے اور اپنی سی کوشش کر کے عبادت و بندگی کرتا ہے تو اُس کی ترقّی ہوگی ضرور اُس کو نجات ملے گی کیونکہ اسمِ اعظم کا لینا بڑا اچھا کام ہے، تو لیکن ایسا نہیں ہے کہ جس کے پاس اسمِ اعظم نہ ہو اُس کو نجات نہ ملے یا رُوحانی ترقّی نہ ہو۔ اِس کے علاوہ بہت سے لوگ اسمِ اعظم لیتے ہیں تو پھر کتنے لوگ اُس میں کامیاب ہو جاتے ہیں؟ یہ مثال بھی بہت ممکن ہے کہ کوئی شخص اسمِ اعظم کو لے مگر اُس کی قدر نہ کرے، ایسے مومن پر یعنی ملامت آئے گی امام کی طرف سے، پوچھنا ہوگا کہ اُس نے خدا کے سب سے بڑے نام کی ناقدری کیوں کی، اُس کی بے حرمتی کیوں کی، اُس نے اُس کو کھیل، مذاق کیوں سمجھا یا اُسے نہیں لینا چاہئے تھا، جب لیا تو ہمّت سے کام لینا تھا، تو یہ مومن کی غفلت سے ہوسکتا ہے یعنی ناکامی، نامرادی اور اسم کو نظر میں نہ لانے اور آہستہ آہستہ اُس کی اہمیت کو بھول جانے اور نہ ڈرنے اور عام سمجھنے، تو اِس میں تمام ناقدری کی بات ہے۔ کوئی مومن ایسا ہو ہر وقت ڈرے کہ میرے پاس اسمِ اعظم ہے اور خدا کے ساتھ عہد و پیمان ہوگیا ہے، تو میں کیسے سوسکتا ہوں، ایک یہ تصوّر رہے۔ ایک یہ ہے کہ چلو ٹھیک ہے آج نہیں ہوا تو کل اور کل نہیں ہوا تو پرسوں تو سو جاؤ آج ذرا یعنی تھکان ہے یا تھوڑی سی کوئی ایسا ہے کہ فرصت نہیں ہے یا کہ وقت گزر چکا ہے وغیرہ وغیرہ، تو دو قسم کے خیال ہو سکتے ہیں، آپ کے نزدیک میں کون سا خیال جائز ہے؟ ڈرنا چاہئے یا کہ غفلت برتنا چاہئے؟ اور اگر غفلت برتی جاتی ہے، یہ بہت بڑی نادانی ہے، ناقدری ہے اور امامؑ کے ایک ایسے خصوصی فرمان کو نظر میں نہیں لانا، ناشکری کرنا اور اتنی ساری امکانی دولت کو تباہ کرنا، برباد کرنا، اتنے سارے خزانوں کو تو ایسے مومن سے وہ اچھا جو اسمِ اعظم میں نہیں ہے لیکن اپنی سی کوشش کرتا ہے تو مولا اُس کو نوازے گا اور اِس سے پوچھے گا جو عہد و پیمان میں تھا لیکن اِس نے اپنے فریضے کو نہیں سمجھا اور جو خزانہ پیش ہو رہا تھا اُس کو نہیں لیا اور اسمِ اعظم کی صورت میں خدا خود کو اِس مومن کے سپرد کر دینا چاہتا تھا، خدا یعنی اِس مومن کے ہاتھ پر خود کو فروخت کر دینا چاہتا تھا، ایسی بھی مثال ہوسکتی ہے کہ خدا جو ہے خود کو فروخت کرے۔

میں ایک ایسی آیت پڑھ کر سناؤں گا کہ اُس میں یہ بات ضرور ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ'' (۹:۱۱۱) خدا نے مومنین کے ساتھ ایک سودا کیا ہے۔ اِس سودے میں خدا نے

مومنین کی جانوں کو لیا ہے، اُن کے اموال کو لیا ہے اور اِس سودے میں خدا اپنی طرف سے اِن کو جنّت دینے والا ہے۔ اگر ہم جنّت سے خدا مراد لیں تو پھر خدا اِس میں بک گیا، خود ہی اُس نے اپنی رحمت سے ایسا کیا۔ کیا اُس حدیث قدسی میں یہ نہیں ہے کہ: جو معرفت حاصل کرے گا تو وہ گنجِ مخفی کو پائے گا، یہ دوسری مثال ہے۔

تیسری مثال میں آپ کو بتاؤں کہ کبھی مجلس میں یہ تذکرہ ہوا تھا کہ خدا فرماتا ہے کہ: جو مجھ کو کثرت سے یاد کرتا ہے تو اُس کو مجھ سے عشق ہوتا ہے اور جو مجھ سے عشق کرتا ہے، محبّت کرتا ہے تو میں اُس کو قتل کرتا ہوں اور میں جس کو قتل کرتا ہوں تو خود ہی وکیل بن کے (case) کو (put up) کرتا ہوں۔ جب (case) کو (put up) کرتا ہوں تو میں ہار جاتا ہوں کیونکہ میں نے اُس کو قتل کیا اور وہ جیت جاتا ہے اور (case) اُس کے حق میں ہو جاتا ہے۔ جب (case) اُس کے حق میں ہو جاتا ہے اور فیصلہ اُس کے مفاد میں ہوتا ہے تو اُس وقت میں خون بہا کے طور پر، جان کے بدلے کے طور پر کیا دیتا ہوں اُس کو؟ کچھ بھی نہیں!! میں خود ایک (life) ایک جان کے بدلے میں، میں خود اُس کا ہو جاتا ہوں یعنی کہتا ہوں کہ لو تمہاری حقیر سی جان گئی تو کیا؟ بس اپنی جان کی جگہ پر مجھ کو لو، میری خودی کو لو، میری انا کو لو۔ اِس مثال میں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ خدا جو ہے اپنے کسی مومن کے ہاتھ پر فروخت ہو جاتا ہے، تو بات یہ ہے کہ اسمِ اعظم کی صورت میں یہ سودا ہونے والا تھا کہ اِس سست و کاہل اور نادان مومن نے مذاق سمجھا، کھیل سمجھا، ڈرا نہیں اور نہ معلوم نفس نے اُس کو فریب دیا یا شیطان نے اُس کے ساتھ ساز باز کیا، شیطان نے سرگوشی کی کان میں، کہا دیکھو کیا ہے، بس ٹھیک ہے آرام سے جو ہو سکتا ہے ٹھیک ہے، نہیں ہوتا ہے تو یہ قسمت کی بات، تقدیر کی بات ہے، تو ایسی طرح طرح کی باتیں ذہن میں آئیں اور حالانکہ اِن میں سے ایسی کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اصل بات تو یہ تھی کہ خدا کے ساتھ عہد و پیمان ہوا تھا، (agreement) ہوئی تھی۔ اِس پہ اِس کو قائم رہنا چاہئے تھا اور بہت یعنی کہ اپنے خلاف سختی سے کام لیتے ہوئے، نفس کو تنبیہہ کرتے ہوئے، نفس کو (warning) دیتے ہوئے، عبادت کے سلسلے کو بڑی سختی کے ساتھ، پابندی کے ساتھ بلکہ دن کو بھی اِس چیز کو سامنے رکھتے ہوئے کہ کس کے ساتھ اُس نے عہد و پیمان کیا ہوا ہے اور صبح چار بجے کے وقت اُس نے کہاں جانا ہے، کیا کام کرنا ہے اور اِس چیز کو ہمیشہ مومن سامنے رکھے، ہمیشہ خیال کرے اور جدوجہد کرے، پابندی کرے، ریاضت کرے، محنت کرے، تیاری کرے اور اُصول کے مطابق عبادت کرے تو اُس کو کامیابی ہوتی اور جس کے نتیجے میں خدا اِس کو مل جاتا ہے۔

میں کہہ رہا تھا کہ اسمِ اعظم کیا ہے؟ خدا ہے بحدِّ قوت اور جب یعنی کہ مومن کامیاب ہو جائے گا تو بحدِّ فعل یعنی وہ واقعہ سامنے آئے گا کیونکہ جب کسی کو ملتا ہے تو عبادت کی صورت میں خدا کا ظہور ہوتا ہے۔ تاہم اتنی بڑی نعمت کو اِس نے ٹھکرائی تو خدا پوچھے گا اور اگر ایک بندہ ہے کسی وجہ سے اُس کی رسائی نہیں ہوئی ہے لیکن بڑا اچھا ہے، مومن ہے، عبادت کرتا ہے، بندگی کرتا ہے تو مولا اُس کو نوازے گا۔ یہ ایک طریقہ ہے یعنی بڑا کام جو ہے یہ بڑا اچھا طریقہ ہے، اُس کو یعنی یا تو شروع ہی

سے نہیں لینا چاہئے اور جو اگر لیا تو جان ہتھیلی پر رکھ کر اُس میں کامیابی کے لئے کوشش کرنی چاہئے یہ ہے۔(اِس کے بعد ڈاکٹر رفیق جنّت علی نے صاحب کے لئے ایک نظم پڑھی)۔

یہ ہے کہ اِس بندۂ خاکسار کی کتنی بڑی سعادت ہے کہ ایسی عالی قدر ہستیاں جو ہمیں اُستاد کی نظر سے دیکھتی ہیں اور حالانکہ دیکھا جائے تو اسمٰعیلی مذہب مونو ریالزم ہے۔آپ ہمیں کچھ بھی سمجھیں، میں اپنے طور سے دیکھتا ہوں جو برابری ہے۔ قرآن کے اندر سورۂ ملک میں ایک آیت ہے: ''مَّا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفَاوُتٍ'' (۶۷:۳)۔اے رسولؐ آپ رحمان کی خلق میں کچھ فرق وتفاوت نہیں دیکھتے ہیں۔یعنی مطلب یہ ہوا کہ ظاہر میں دیکھا جائے تو اِس دنیا کے اندر ایک مخلوق کیڑا ہے، کوئی ہاتھی ہے، کوئی مکھی ہے، کوئی انسان ہے، کوئی جانور ہے، کوئی درخت ہے، کوئی پتّھر ہے، فرق تو ہے لیکن اِس فرق کے باوجود کیوں کہا جاتا ہے کہ رحمان کی مخلوق میں فرق نہیں ہے؟ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی سطح ہے، کوئی بلندی ہے، جہاں پر کچھ رُوحیں ہیں اُن میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ صحیح معنوں میں رحمان کی مخلوق ہیں۔خدا کسی کیڑے کو اور ناقص مخلوق کو اپنی ذات سے منسوب کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا ہے کہ میری مخلوق ہے، لوگ کچھ بھی سمجھیں لیکن حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ جو ادنیٰ سی مخلوقات ہیں یہ خدا کی مخلوقات نہیں ہیں، رحمان کی مخلوقات نہیں ہیں۔جب فرمایا جاتا ہے کہ رحمان کی مخلوقات، اِس سے کچھ اُونچے درجے مراد ہیں یعنی ہماری رُوحیں جس بلندی سے آئی ہوئی ہیں، جس سطح سے اور جس نور کے سرچشمے سے کرنوں کی طرح پھوٹ کے اِس سیارۂ زمین پر شخصیتوں کے اندر جو ہماری انائیں رہتی ہیں تو اِن اناؤں کا وہ سرا جو نور کے سرچشمے کے قریب ہے، جو نور کے سرچشمے کے قریب ہے یا نور کے سرچشمے سے باہر ہے وہ رحمان کی مخلوق ہے، وہ سب یکسان ہیں، ظاہری طور پر، دُنیاوی طور پر، اخلاقی طور پر، ادب کے طور پر آپ ہمیں کچھ بھی کہیں لیکن اُس وقت میرے دل میں کوئی فخر و بڑھائی نہیں آسکتا ہے اور اگر آگیا تو بس میں پھر کیا کام کرسکتا ہوں کیونکہ ہمارے کام کرنے کا اُصول جیسا کے آپ جانتے ہیں عجز وانکساری ہے۔

ہم ہر وقت آنسو بہانے کے لئے اِس لئے کوشش کرتے ہیں کہ ہماری زندگی، ہماری بقا، ہمارے کام کا دارومدار اِسی میں ہے اور اگر فخر آگیا اور مستقلاً اُس نے اپنے لئے جگہ بنالیا تو ہم گئے، کام ختم ہوگیا۔اُس وقت کچھ بھی ہمارا مقام نہیں رہے گا اور نہ کوئی کام ہوگا، یہ رُوحانیت کا اُصول نہیں ہے۔جو ایک درویش رُوحانی مدد کی طرف دیکھتا ہے جس کو اُمید ہے کہ مولا کے حضور کی طرف سے کوئی تائید آوے تو اُس کے لئے اُصول یہ ہوتا ہے کہ خود کو بار بار مٹائے، بار بار مٹائے اور اِس مٹانے کے لئے ہم مختلف بہانے، وسیلے ڈھونڈتے ہیں اور اُن مختلف بہانوں، وسیلوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ایسے اچھے مومنین کے ساتھ بیٹھیں، آپ کی رُوحوں کی مدد سے، آپ سے مل کر کچھ عاجزی کریں کیونکہ اِس میں (reaction) بھی ہوتا ہے نا! (reaction) ضرور ہوتا ہے۔آدمی تنہا اتنی اچھی عبادت نہیں کرسکتا ہے جتنی کہ اچھے مومنین

کے ساتھ مل کر عبادت کرتا ہے اور خصوصاً کوئی اُستاد جس کے سامنے اچھے اچھے شاگرد بیٹھے ہوں تو اُس میں یعنی کہ (reaction) ہوتا ہے، ردِعمل ہوتا ہے۔ ردِعمل اُس کو کہتے ہیں کہ کسی شخص نے ہاتھ میں لاٹھی لی اور پتّھر پر ماری تو اب (reaction) اِس کا یہ ہوگا کہ اُلٹا اُس کے ہاتھ میں درد پیدا ہو جائے گا۔ یہ تو خیر یعنی کہ (negatively) بات ہوگئی، اِس طرح اچھے کام بھی ہیں کہ اِس لاٹھی کے (reaction) کی طرح کچھ اچھا (reaction) بھی ہے۔ جس طرح آپ نے کوئی نیکی کی تو اُس وقت آپ رُوحانی طور پر خوش ہوتے ہیں، نیکی تو کسی اور نے لی لیکن جو آپ کو خوشی مل رہی ہے یہ ردِعمل ہے، ردِعمل ہے۔ اِس لئے یعنی کہتے ہیں کہ گنبد کی صدا، ایک طرح سے یعنی کوئی کسی گنبد میں آواز دیتا ہے، پکارتا ہے تو اُس کی جو آواز ہے اُس گنبد سے ٹکرا کر لوٹتی ہے تو بُرائی بھی لوٹتی ہے، اچھائی بھی لوٹتی ہے۔ یہ گنبد کی صدا کی مثال ہے یا اِس پتّھر پر لاٹھی کے مارنے کی مثال ہے۔

مطلب کی بات یہ ہے کہ ہمیں سب سے بڑا مزہ اُس میں آتا ہے کہ جہاں ہم آپ ایسے مومنین کے ساتھ مل کے بیٹھیں، مجھے معلوم ہے کہ آپ کی کیا ہستی ہے، کیسی کیسی ہستیاں یہاں بیٹھی ہیں۔ دیکھیں کہ میں صرف تیسری اور چوتھی پڑھا ہوں اور آپ کی جو (qualification) ہے، جو دُنیوی تعلیم ہے، جو قابلیت ہے، جو جماعت میں مقام ہے، جو خدمت ہے، جو منصوبے ہیں اور جو آپ کی شخصیت ہے، جو خاندان ہے، جو دولت خدا نے دی ہے، جو ہنر دیا ہے اِس کو دیکھیں۔ اگر میری آنکھیں کچھ بھی کام نہیں کرتی ہیں تو شاید وہ بات الگ ہے، اگر میری آنکھیں مجھے مدد دے سکتی ہیں تو مجھے قدر کرنی چاہئے اور اگر مجھ میں قوت ہے، صلاحیت ہے تو شکر کرنا چاہئے کہ آپ ایسے افراد جو ہیں اِس درویش سے وابستہ ہیں اور کل کو آپ میں سے ہر ایک ہزاروں کو تعلیم (pass) کر سکے گا۔ میں ہر شخص کو ایک نہیں ہزار سمجھتا ہوں بلکہ لاکھ سمجھتا ہوں۔ کل کو ایک (leader) پیدا ہو جائے، ایک عالم پیدا ہو جائے تو وہ ہزاروں کو، لاکھوں کو بتائے گا۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے، میں خوش نصیب ہوں آپ جیسے افراد اور رُوحانی دوست ملے ہیں اور ایسے فرشتوں کے درمیان بیٹھیں اور وقت گزاریں تو پروردگارِ عالم کی بہت عظیم نعمت ہے اور آپ یعنی بزرگانِ دین کی کتابوں کو پڑھیں اور اُس میں جن پیغمبروں کو اچھے اچھے مُرید ملتے تھے اُس کا ذکر ہے قرآن میں، بہت شاندار طریقے سے ہے یعنی کسی کا شاگرد جو ہوتا ہے وہ بیٹے کے طور پر اُس کا ذکر ہوتا ہے قرآن میں مثلاً کسی پیغمبر کے بیٹے ہونے کا ذکر ہے، اولاد ہونے کا ذکر ہے اور حالانکہ وہ تو شاگردگی کے معنی میں ہے اور اگر کسی پیغمبر کا واقعاً سچ اور سگا بیٹا بھی ہے تو اُس میں کیا معلوم اُس کے دو پہلو ہوتے ہیں یعنی میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ پیغمبروں کا ذکر ہے قرآن میں اور اُن کی اولاد پہلے کچھ وقت کے لئے نہیں ہوتی ہے تو وہ دُعا کرتے ہیں کہ خداوند ہماری اولاد ہو تو ہماری وراثت قائم رہے گی۔

اب اِس کے دو پہلو ہیں ایک پہلو یہ کہ وہ دُنیوی طور سے یہ کہتے ہوں کہ اُن کے گھر بار سنبھالنے کے لئے اولاد

چاہیئے۔ایک پہلو یہ ہے کہ وہ دین کو سنبھالنے کے لئے اِس (sense) میں خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ میراث جو ہے وہ اِس [سے چلے] اور اِس میں کسی مومن کو کیا شک ہوسکتا ہے کہ پیغمبروں کے پاس یہ دوسرا پہلو ہے اور جو پہلا پہلو ہے جسمانی اولاد کا وہ تو ذیلی اور ضمنی بات ہے۔اصل بات جو ہے وہ رُوحانی وراثت کی بات ہے تو اِس سے ظاہر ہے کہ یعنی شاگرد کیا ہوتا ہے، شاگرد تو فرزند ہوتا ہے جو کہ اُستاد جو باپ کی جگہ پر ہے اُس کی وراثت کو قائم رکھتا ہے اور اُس کے پیچھے کام کو سنبھالتا ہے۔دُنیا کے اندر اپنے نظریے کو آگے بڑھانا بھی کس قدر اہم چیز ہے نا! اگر ایک آدمی دُنیا میں چند دن کے لئے کام کرتا ہے اور پھر مٹ جاتا ہے، پانی کی سطح پر یعنی کہ پانی کا ایک بلبلا ہوتا ہے، وہ کچھ دیر کے بعد ختم ہو جاتا ہے، اُس کا وجود قائم نہیں رہتا ہے۔اِسی طرح اگر ہماری اِس جسمانی ہستی کے ساتھ ساتھ ہمارا کام، ہماری تعلیم اور ہماری ہر چیز مٹ گئی تو پھر اِس میں کیا خوشی ہے۔اچھا یہ ہے کہ ہمارے پیچھے کچھ اولاد ایسی ہو کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ ہم سے بھی زیادہ ترقّی کرے۔ ہر باپ کیا چاہتا ہے جسمانی مثال میں؟ ہر باپ یہ چاہتا ہے کہ اُس کا بیٹا اُس سے بڑھ کر ہنر مند ہو۔باپ کو بیٹے کی ترقّی پر نہ تو رشک ہوتا ہے اور نہ حسد، باپ تو چاہتا ہے کہ اُس سے بڑھ کر ہو بیٹا اور پوتا اُس سے بھی بڑھ کر ہو اور آئندہ نسل اُس سے بھی بڑھ کر ہو، تو قدرتی بات ہے، اِسی طرح میں چاہتا ہوں کہ میرے شاگرد، عزیزان جو ہیں، مجھ سے بڑھ کر ترقّی کریں، علم میں، عبادت میں، خدمت میں، بہت سے پہلو ہیں، بہت سے میدان ہیں۔کسی نہ کسی میدان میں مجھ سے اچھا کام کریں تو مجھ کو خوشی ہوگی۔قرآن میں ایک آیت کے اندر آیا ہے کہ خداوندِ عالم نے اولاد کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے (۱۷:۳۱)۔ اب ذرا دیکھا جائے تو دُنیا کے اندر ایسے لوگ تو نہیں ہیں، اِس کی مثال بہت کم ملتی ہے کہ کوئی اولاد کو قتل کرتا ہو۔یہ تاویل کی بات ہے، اولاد کو قتل کرنے کی تاویل یہ ہے کہ کوئی اُستاد بخیل، کنجوس ایسا ہو کہ وہ اپنے شاگردوں کو علم نہیں دیتا ہے۔ اِس لئے نہیں دیتا ہے کہ وہ ڈرتا ہے اُس کے پاس جو علم ہے وہ اِن شاگردوں کو حاصل ہوگا تو کل کو اُس کا نام ختم ہو جائے گا اور زندگی ہی میں یہ آگے بڑھیں گے اور جو شخص ایسا سوچتا ہے تو وہ اپنے شاگردوں کو علم نہیں دیتا ہے، تو لیکن یہ بات جو ہے بہت ہی ادنیٰ بات ہے اور اِس کی مثال معلوم نہیں کہاں کہاں ملتی ہے، لیکن جو مہربان باپ ہے وہ اِس طرح سے نہیں سوچتا ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ وہ اپنے بچّوں کی ترقّی چاہتا ہے اور دوسری مثال اِس کی یہ ہے کہ میں بہت اہم بات بتاؤں گا۔آپ میں سے اکثر حضرات دوسرے جنم کی بات کرتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ انسان کا دوسرا جنم کیا ہے؟ وہ اُس کے شاگرد ہیں، جیتے جی۔کیونکہ رُوح کی کتاب آپ نے تو پڑھی ہے، ماشاء اللہ ہم نے تو رُوح کے سلسلے میں ایک قانون یا ایک (formula) پیش کیا ہے، بہت آسانی ہوگئی ہے، تو ذرا بھی رُوح کی بات ہو تو اُس کتاب کا حوالہ دیتے ہیں تو رُوح کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ رُوح ایک (limited) چیز نہیں ہے کہ ایک ہی جسم کو اختیار کرے دوسرے جنم کے لئے۔ اگر دوسرا جنم ہے تو اِس طرح سے ہے کہ جیتے جی بہت سارے افراد کو جو تعلیم ملتی ہے تو وہ اِس علم کی رُوح میں

اُستاد اُن میں منتقل ہو جاتا ہے اور دوسرے جنم کا ثبوت، جیتے جی دوسرے جنم کا ثبوت یہ ہے کہ امامؑ کو آپ دیکھتے ہیں کہ جامہ جب تبدیل ہوتا ہے، تو اِس جامہ کے تبدیلی سے قبل ہی نیا جامہ جو ہے تیار ہی ہوتا ہے۔ ایسا تو نہیں ہوتا ہے کہ وقت تلک جو ہے اس نور کو کوئی جامہ یا کپڑا نہیں ملے۔ جامہ فارسی کا لفظ ہے، جامہ لباس کو، کپڑے کو کہتے ہیں۔ تو یہ ہم نے اصطلاح بنائی ہے، اسماعیلیوں نے کہ جامہ اور حقیقت میں اِس نور کے لئے جامہ ہے، لباس ہے، کپڑا ہے جسم، تو امامؑ کا جامہ جب تبدیل کرنا ہوتا ہے تو اُس وقت (already) وہ نیا جامہ اُدھر تیار ہوتا ہے بلکہ قبل از وقت آہستہ آہستہ علم سے، اسمِ اعظم سے، محبّت سے اور دیگر وسائل سے نور جو ہے وہ اس نئے جامے میں منتقل ہوا ہوتا ہے اور صرف ایک چیز باقی رہتی ہے، وہ امر ہے، اختیار (authority)۔ باقی ہر چیز منتقل ہو کر وہاں بالکل تیار ہی ہوتی ہے، جب امامؑ کی ہر بات میں، امامؑ کی حیات میں، ممات میں ہمارے لئے ہدایت ہے تو یہ بھی ہمارے لئے ہدایت ہے کہ ہم سمجھیں کہ دوسرا جنم کیا ہے۔ دوسرا جنم یہ ہے کہ اگر ہم سمجھتے ہیں اور اپنی رُوح کو علم کے وسیلے سے، علم کے پُل سے، علم کے رستے سے آپ میں منتقل کر سکتے ہیں تو یہ ہمارا دوسرا جنم ہے اور ہمارا نیا لباس ہے۔ تو بھلا ایک شخص اتنا کچھ جانتا ہے تو وہ اپنے شاگردوں سے کیسے محبّت نہیں کرے گا میں جب جانتا ہوں کہ آپ میری انائیں ہیں، میری ہستی ہیں، میرے دوسرے جنم ہیں تو میں آپ کو کیسے نہ چاہوں اور کیوں نہ کوشش کروں کہ آپ کو علم ملے اور شاید میں پھر بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھے بہت زیادہ کوشش کرنی چاہیئے اِس لئے کہ آپ ہماری خودی ہیں، ہماری رُوح ہیں، ہمارے نئے لباس ہیں، ہمارے دوسرے جنم ہیں۔

چونکہ ہم ذرّے کو مانتے ہیں یعنی ذرّات تو ذرّات پر مشتمل ہے رُوح، ذرّات کا مجموعہ ہے اور جس چیز کو I یا کہ انا کہا جاتا ہے وہ ایک (unity) ہے۔ جس طرح اِس جمعیّت کی کوئی (unity) ہو سکتی ہے، تو وہ (unity) اِس جمعیّت کی I ہے، انا ہے۔ ہمارے اندر کوئی ایک (particular) ذرّہ نہیں ہے بلکہ اِن تمام (units) اور ذرّات کے آپس میں ایک توحید ہے، ایک (unity) ہے تو وہ (unity) جو ہے بے مثال شئ ہے یعنی ہمارے اندر بھی خدا کی طرح ایک بے مثال شئ ہے۔ کیا ہے وہ؟ وہ (unity) ہے اور (unity) کوئی چیز نہیں ہے لیکن وہ ایک بے مثال شئ ہے مثلاً ہمارے آپس میں جو (unity) ہوگی اُس (unity) کو کس طرح ہم پیش کریں گے؟ (unity) یعنی اتحاد تو ہم جانتے ہیں لیکن اُس کے لئے کوئی (particular) چیز نہیں ہے، وہ کوئی مادّی شئ نہیں ہے وہ ایک توحید ہے، تو ہمارے اِن ذرّات کے اندر بھی وہی توحید ہے جس طرح مونور یا لزم کی توحید ہے، جو عقلِ کُلّ، نفسِ کُلّ، ناطق، اساس کے درمیان جو توحید ہے وہی خدا کی توحید ہے تو اُس توحید جیسی توحید یہاں بھی ہے اور آگے چل کر یہ توحید اُس توحید میں مدغم ہو جاتی ہے، توحید میں توحید کا مدغم ہو جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے، تو یہ ہے کہ پانی سے پانی مل جاتا ہے اور آگ کے ساتھ آگ ایک ہو جاتی ہے اور سردی کے ساتھ سردی ضِدّ نہیں ہے، (opposite) نہیں ہے، وہ ایک ہی صفت ہے۔ اِس طرح توحید کے ساتھ

توحید جو ہے وہ ازل سے ایک ہے اور ابد میں بھی ایک اور حال میں بھی وہ ایک ہوسکتی ہے۔ اِس لئے ہمارے اِن ذرّات کے اندر جو رُوح کے ذرّات ہیں اِن کے اندر ایک (unity) ہے تو وہ ہماری I ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میں بہت شکر گزار ہوں، ممنون ہوں، کہ آپ اِس شان سے آتے ہیں، توجّہ فرماتے ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ آپ کی اِس کوشش میں مولا بہت برکت پیدا کرے گا اور جب خلوص اِس طرف بھی ہے، اُس طرف بھی ہے اور علم کی روشنی میں ہے، دین کی ترقّی کی خاطر ہے، ہم کچھ دُنیا کی چیز نہیں چاہتے ہیں، کوئی بڑائی نہیں چاہتے ہیں، کوئی عمل نہیں چاہتے ہیں، کوئی عملداری نہیں چاہتے ہیں۔ بس ہمارا کام یہ ہے اور ہم اِس سے خوش ہیں کہ کسی گوشے میں بیٹھ کر دو ، چار آنسو گرائیں اور خود کو بار بار مٹائیں، فنا ہو جائیں۔ یہ ہمارا نصب العین ہے تا کہ اِس کے نتیجے میں خدا کی جو رحمت ہے وہ اِس طرف کو آوے اور کچھ علم ملے، کچھ توفیق ملے، کچھ خدمت ہو جائے، تو آپ ذرا غور سے دیکھیں گے تو اِس جمعیّت کے اندر بہت سے معجزات ہیں یعنی بہت سی برکتیں ہیں۔ کبھی آپ نے یہ دیکھا کہ کسی (meeting) میں کبھی اختلاف ہوا، کبھی آپ نے دیکھا کہ کسی عملدار کے تعیّن میں کچھ باتیں ہوگئیں، کبھی آپ نے دیکھا یہاں ہم آپس میں کبھی کسی بات پر روٹھ گئے، کبھی آپ نے دیکھا کبھی کسی بات پر کسی نے انکار کیا؟ تو ہم نے ایک اُصول بنایا ہے اور وہ اُصول کیا ہے؟ بس اتحاد، اتفاق، توجّہ، محبّت، شفقت۔ جس طرح شاگرد استاد کا ہاتھ چومتا ہے تو اُستاد بھی بڑے شوق سے شاگرد کے ہاتھ کو چومتا ہے، یہ نرالی بات ہے، معلوم نہیں لوگ کیا سمجھیں گے لیکن ہم نے اِس کو اُصول بنایا ہے۔ ایسا نہ کہ یہاں فخر کے لئے کوئی جگہ ہو، بڑائی کے لئے کوئی جگہ ہو، یہ سب کچھ مولا کی رحمت ہے اور یہ کامیابی، یہ اس قدر توقع سے زیادہ کامیابی ہے اور ہر جگہ پر کامیابی ہے اور (branches) آپ کو کس طرح سے خط لکھتے ہیں اور آپ اِن کو کیا خط لکھتے ہیں۔ دیکھیں کیسے الفاظ ہوتے ہیں، اداروں میں تو (formalities) ہوتی ہیں، اُن میں تو یعنی کہ اُصول کے مطابق خط لکھتے ہیں وہ دوسروں کے اُصول کو اپناتے ہیں۔ ہم نے اپنا ایک اُصول بنایا ہے، وہ اُصول ہے شفقت و مہربانی کا، محبّت کا، اتفاق کا، اتحاد کا اور سب سے بڑھ کر مونو ریالزم کا کہ ہم ہر بار اِس اصطلاح کو دُہراتے ہیں کیونکہ ہم مونو ریالزم ہیں، تو مولا آپ کو ترقّی دے، کامیابی دے [آمین] اور آپ کو بصیرت عطا فرمائے [آمین] اِس سے زیادہ اور عبادت میں آپ کی ترقّی ہو [آمین]، علم میں اور مولا کی خدمت میں [آمین]، امامؑ کی خدمت میں [آمین] اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولا کی رضا اور اُس کی خوشنودی آپ کو حاصل ہو۔ آمین، یاربّ العالمین۔ شکریہ۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: ثناء وزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: عبادت اور امام سلطان محمّد شاہ صلوات اللہ علیہ کے پاک فرامین

کیسٹ نمبر: ۶۸ تاریخ: جولائی ۱۹۸۲ء کراچی

عزیزانِ من! رُوحوں کے متعلق آپ کا ہمارا یقین ہے، کہ رُوح اُس کی عظیم رُوح سے ہے، کہ رُوح عجیب شیٔ ہے کہ رُوح عجیب دُنیا ہے کہ رُوح ایک روشنی ہے لیکن اُسی کی روشنی میں سے ہے، کہ رُوح ایک عکس ہے لیکن یہ عکس اُسی کا ہے کہ رُوح ایک تصویر ہے لیکن یہ تصویر اُسی کی ہے، واللہ! اِس تصویر کی خدمت کی جائے جو اُسی کی تصویر ہے اور زندہ تصویر ہے، عجائبات سے غرائبات سے پُر اور بہت ہی حسین وجمیل ایک عکس، ایک صورتِ نورانی جو رُوح ہے اور ایک دُنیا ہے، ایک باغ ہے، ایک بہشت ہے کہ جنّت ہے، روشنی کی ایک بھرپور دُنیا۔

اے کاش! کتنی نادانی ہے کہ کوئی اپنی رُوح کی خبر نہیں رکھتا اور رُوح کو کدورتوں کے ڈھیر کے اندر دبا کے رکھتا ہے اور اِس لئے قرآن نے رُوح کی پاکیزگی کی اہمیت بتائی اور فرمایا کہ: ”قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰٮهَا“ (۹:۹۱) رُوح کی پاکیزگی کے لئے اِس میں تاکید کی گئی، رُوح کی پاکیزگی عبادت سے اور علم سے ہوتی ہے لیکن کس عبادت سے اور کس علم سے؟ عبادتیں تو بہت ہیں، کچھ عبادتیں صراطِ مستقیم سے باہر ہیں، ایسی عبادتوں کا ذکر ہی نہیں۔ آج یہود بھی عبادت کرتے ہیں اور نصاریٰ بھی عبادت کرتے ہیں، ہندو کب عبادت نہیں کرتے ہیں، اِس دُنیا کے اندر جتنے مذاہب ہیں اُن میں سے ہر مذہب والے عبادت کرتے ہیں لیکن یہ دیکھنا ہے کہ کونسی عبادت خدا کے معیار کے مطابق ہے، خدا کی خوشنودی کے مطابق کونسی عبادت ہے، کونسی بندگی ہے۔ ہمیں اسلام کی عبادت چاہیئے، دینِ اِسلام کی عبادت چاہیئے، لیکن دینِ اِسلام کے اندر بھی طبقات ہیں، مختلف درجات ہیں تو پھر کونسی عبادت؟ ہمیں عاشقانہ عبادت چاہیئے، درویشانہ عبادت چاہیئے، ایک حقیقی مومن کی جو عبادت ہونی چاہیئے وہی چاہیئے ہم کو، ایسی عبادت چاہیئے جو ہم کو آگے بڑھائے اور کامیاب ہو، ہم کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے ہم کو ایسی عبادت چاہیئے۔ ایسی عبادت چاہیئے کہ ہم عبادت کریں اور دل کی صفائی ہو، سکون ملے، ہمیں یقین حاصل ہو کہ ہماری عبادت بہت اچھی تھی، ہم کو اِس سے خوشی ملے۔ جس طرح دُنیا کے اندر کوئی شخص جسمانی، مادّی خوراک کھا کر محسوس کرتا ہے کہ وہ غذا کیا تھی اور کیسی تھی، کھانا کیسا تھا وہ (feel) کرتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے، وہ اندازہ کرتا ہے اور اُس کی تقدیر کرتا ہے یعنی کہتا ہے کہ کھانا اِس قسم کا تھا وہ کچھ بتا سکتا ہے اسی طرح عبادت جو ہم کرتے ہیں

اس کے متعلق ہمارے اندر کوئی فیصلہ ہونا چاہئے، ہمیں یقین ہونا چاہئے کہ ہم نے جو عبادت کی وہ بہت اعلیٰ عبادت تھی، اِس لئے کہ ہمارے دل کے اندر جو کدورت تھی یا جو تاریکی تھی یا جو غم تھا یا دُنیا کی جو فکر تھی وہ یکسر مٹ گئی، یہ عبادت کا معجزہ ہے اور بالکل ہمیں اُس سے قوت ملی۔ چونکہ امامؑ نے ہم کو یہ معیار دیا ہے، یہ ایک کسوٹی دی ہے، فرمایا ہے کہ عبادت کے اندر خوشی ہے [نیروبی، ۷ ستمبر ۱۹۶۳ء] اور دیکھیں کہ یہ ایک معیار ہے، اگر ہم عبادت سے خوشی کو نہیں پاتے ہیں تو گویا ہم نے عبادت نہیں کی، ہم نے وہ عبادت نہیں کی جو امامؑ کے پیشِ نظر تھی اِس معیار کے مطابق، اِس ارشادِ مبارک کے مطابق جو مسرّت و شادمانی عبادت میں بتائی گئی تھی اگر ہم اُس مسرّت و شادمانی کو نہیں پاتے ہیں تو ہم میں نقص ہے، عبادت میں نقص نہیں ہے، دین میں نقص نہیں ہے، نظریے میں نقص نہیں ہے، تو یہ نقص ہماری عادتوں میں ہوسکتا ہے اور ہم میں عیب ہوسکتا ہے، ہم میں کمی ہوسکتی ہے، ہمارے گناہ ہوسکتے ہیں، اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم پاک ہیں، پوِتر ہیں، صاف ہیں تو یہ بہت بڑی بات ہے، یہ ادب نہیں ہے یہ خدا کی شان میں گستاخی ہے۔

دیکھیں کہ آدم خلیفۂ خدا تھے، تو اُس نے کس حد تک ادب کا لحاظ رکھا اور ابلیس نے کتنی بڑائی کی تو آدمؑ کو جو بہشت سے نکالا گیا تو پھر بھی وہ اپنی غلطی پر نادم تھے، اُس کو ندامت تھی، پشیمان تھے، وہ تائب تھے، توبہ کرتے تھے، روتے تھے اور طرح طرح کی کوششوں سے وہ توبہ کرتے تھے، تو اگر ہم صحیح معنوں میں اولادِ آدم ہیں، تو ہمیں عجز و انکساری سے کام لینا چاہئے اور گناہ جس چیز کا نام ہے وہ بہت باریکی تک جاتی ہے، وہ بہت باریکی تک جاتی ہے، تو خداوندِ عالم کے حضور میں جو پرکھنے کا معیار ہے یا جو کسوٹی ہے وہ بہت باریکی سے ہمارے اعمال کو تولتی ہے، اِس کے لئے خیال رکھنا چاہئے۔ بہرحال عبادت کی بات تھی کہ ہماری عبادت کیسی ہونی چاہئے، اُس کا ہم کو یقین ہونا چاہئے کہ ہم نے عبادت کی اِس سے ہم کو خوشی ملی اور اب علم کی بات، کیونکہ میں نے اِس موضوع کے درمیان میں آتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہمیں عبادت سے اور علم سے آگے بڑھنا چاہئے، ترقّی کرنی چاہئے اور اِس پاک مذہب سے فائدہ اُٹھانا چاہئے، تو اِس سلسلے میں، میں نے تھوڑی سی بات عبادت کے بارے میں کی، اب میں علم کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں کہ وہ علم کون سا ہونا چاہئے۔ بالکل جس طرح عبادت کے یقینی ہونے کا اندازہ ہوسکتا ہے اور جس کی مثال ہم نے یہ بتائی کہ کوئی مادّی غذا کھانے والا یہ بتا سکتا ہے کہ اُس نے کیا کھایا اور اُس کو اُس کھانے سے کیسے مزے آئے یا کیا لذّت ملی اور پھر اِس غذا سے اُس کو جو قوت ملے گی اُس سے بھی وہ اندازہ کرسکتا ہے، اُس غذا کی قدر و قیمت کا تعیّن کرسکتا ہے کہ اُس نے کیا کھایا۔ بالکل اسی طرح سے علم کا بھی یہی حال ہے جو حقیقی علم ہوگا اُس کا پتہ چلے گا، اُس کا پتہ چلے گا کہ حقیقی علم تھا، اُس کے دل سے کتنے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگیا، اُس کو یقین آیا کہ یہ جو علم تھا حقیقی علم تھا، سچّا علم تھا، بڑا مزہ آیا اور بہت اِس سے فائدہ ملا اور اُس کو سکون ملا، خوشی ہوئی اور دل کو راحت ملی، تو بالکل جو سچّا علم ہوگا تو اُس کو معلوم ہو جائے گا، لیکن ہاں! اِس کے لئے بھی مومن کے پاس تھوڑا

سا معیار ہونا چاہیئے، جو اگر مومن کے پاس معیار ہے (standard) ہے، کسوٹی ہے تو وہ حقیقی علم کا بخوبی اندازہ کر سکے گا اور اگر کوئی مومن ایسا ہے کہ اُس نے رُوحانیت کی اعلیٰ غذائیں کھائی ہیں یعنی اُس نے اعلیٰ علم سنا ہے اور اعلیٰ عبادت کی ہے تو ایسا مومن جہاں بھی جائے گا اُس کو پتہ چلے گا کہ علم کا دعویٰ کرنے والا جو علم کی باتیں بتانے کا دعویٰ کرتا ہے یا کسی درجے میں وہ علم کی باتیں بتاتا ہے تو ایسے مومن کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس علم میں کتنا سکون ہے یا کس (standard) کا علم ہے وغیرہ، تو جب اُس کو یقین ہوتا ہے، اندازہ ہوتا ہے تو اِس کے یہ معنی ہوئے کہ اِس کے پاس کوئی (standard) ہے، کوئی معیار ہے۔

بہر حال دیکھیں کہ ہم آپ سب اسمٰعیلی مذہب میں کیوں پیدا کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ اسمٰعیلی مذہب کیا ہے؟ اُس کے بعد اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ دُنیا کے اندر اسمٰعیلی مذہب ست پنتھ ہے اور یہ سردار مذہب ہے، یہ مذاہب کا بادشاہ ہے، شاہنشاہ ہے، سچّا دین ہے، پیغمبروں کا اور اولیاء اللہ کا دین ہے یہ، اگر ہم اِن الفاظ کے معنی میں اِس دین کو مانتے ہیں تو پھر دُوسرے مرحلے میں ہمیں یہ سوچنا ہوگا، ہمیں فکر کرنی ہوگی کہ ہم اِس مذہب میں کیوں آئے ہیں؟ اگر ہم کو اِس مذہب کے اندر پیدا کیا گیا ہے تو آخر کار اِس کا کوئی مقصد ہے، ایسا تو نہیں ہے کہ بس یعنی وقت گزارنے کے لئے آئے ہیں، ایسا تو نہیں ہے کہ اِس مذہب میں ہم اِس لئے آئے ہیں کہ زیادہ کھائیں اور زیادہ کمائیں اور عیش و آرام کی زندگی گزاریں، عیش و آرام کی زندگی اِس سے باہر بھی بہت زیادہ ہو سکتی ہے اور اگر کھانے پینے کی بات ہے تو کتنے پرندے ہیں، کتنے آزاد جانور ہیں جنگلوں میں اور شکاری جانور، جن کے لئے سب کچھ ہے، یہ بات نہیں ہے۔ اِس مذہب میں آنے کا آخر کوئی بڑا مقصد ہے، وہ مقصد یہ ہے کہ مقصد کے دو حصّے ہیں، ایک مقصد یہ کہ ہم خود کو اِس قابل بنائیں کہ کوئی کام کریں، جب ہم کو پیغمبروں کے دین میں بھیجا گیا، اولیاء اللہ کے دین میں بھیجا گیا تو اِس کا مقصد یہ ہو سکتا ہے اور یقیناً یہی ہے کہ ہم نے یہاں کچھ کام کرنا ہے اِس کام کے کرنے کے لئے پہلے پہل خود کو تیار کرنا ہوگا اور پھر کام کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک علم کی خدمت سے بڑھ کر کوئی خدمت نہیں، ہم نے مغرب کے اندر جہاں ہمارے بہت سے عزیز دوست تھے اور دُوسرے احباب تھے، دین بھائی تھے اُن کے درمیان بھی میں نے اِس مقصد کی وضاحت کی کہ علمی خدمت سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی خدمت نہیں ہے۔ میرا مقصد دینی علم، رُوحانی علم ہے اِس لئے کہ یہ ایک ایسی دولت ہے جو آپ سب کو (distribute) کر سکتے ہیں اور اِس کے باوجود بھی وہ دولت کبھی کم نہیں ہو سکتی ہے اور اگر آپ اپنے سامنے مادّی دولت کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگائیں اور تقسیم کرتے جائیں تو تھوڑے ہی وقت میں وہ دولت ختم ہو جائے گی، خواہ وہ دولت قارون کی دولت جیسی کیوں نہ ہو، لیکن وہ ختم ہو جائے گی، کیونکہ وہ مادی شئ ہے، لیکن علم جو رُوحانی دولت ہے، جو ایک نور ہے جو ایک روشنی ہے یہ کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج اِس زمانے میں اور اِس دُنیا کے اندر علمی خدمت کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ آپ بے نیاز ہو کر کسی تعریف سے، کسی معاوضے سے، کسی ٹائٹل سے، کسی بڑائی،

بزرگی سے بے نیاز ہو کر خدمت کریں تو مولا آپ کو خود بخود نوازے گا۔

اِس دو دن کی زندگی کی کوئی بات نہیں ہے، جو دائمی جہان ہے، جو دائمی زندگی ہے وہاں پر آپ کو خداوند نوازے گا، اِس طرح آپ اِس خدمت میں مستعد رہیں اور آپ ایک سپاہی کی طرح کام کریں، ہمارے مذہب میں یہ خدمت کا جذبہ سکھایا گیا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ بعض مثالیں جو ہیں ہمارے اندر قابلِ تعریف ہیں اور ہمارے مقدّس جماعت خانے کے باہر دیکھتے ہیں کہ کتنے ایسے اچھے گھرانوں کے فرزند ہیں جو (shoes company) میں کمر بستہ ہیں کہ وہ جماعتوں کے جوتوں کو سینے سے لگا کے، کسی بڑائی کے بغیر، کسی فخر کے بغیر رکھتے ہیں اور اُتارتے ہیں، دیتے ہیں، مجھے اِس سے بڑا مزہ آتا ہے، اس طرح (volunteers) کی خدمت ہے، اِس طرح اور کئی خدمات ہیں جو ہمارے لئے مثال ہیں اور بے شک علم کی خدمت کسی ایک جماعت تک محدود نہیں اور [آپ] بڑے خوش نصیب ہیں کہ علمی خدمت انجام دیتے ہیں ۔ میں (request) کروں گا کہ اور زیادہ اِس خدمت کی طرف توجّہ دی جائے اور اچھی طرح سے منظّم طریقے سے اِس کو آگے بڑھایا جائے اور میں بتاؤں گا کسی اور وقت کہ کس طرح یہ خدمت ساری جماعت کے لئے اور دُنیائے اسماعیلیت کے لئے مفید ثابت ہو رہی ہے ۔ میں کبھی بتاؤں گا آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا، کیونکہ میں باہر سے آیا ہوں اور مجھے کچھ اچھے حالات معلوم ہوئے ہیں کہ آپ جو خدمت کرتے ہیں یہ کس طرح ہمارے اسماعیلی بھائیوں کو فائدہ دے رہی ہے اور اِس سے کتنے لوگ اور کن کن ملکوں میں مستفیض ہو رہے ہیں، اِس کا علم ہوا ہے، میں آپ کو اِس کی رپورٹ کروں گا۔

اب میں اِس مضمون سے دُوسرے مضمون کی طرف جاتا ہوں اور یہ تو ایک تعریف تھی یا ایک تعارف تھا اور کچھ عبادت و بندگی کے سلسلے میں کچھ تشویق تھی، کچھ شوق دلانا تھا کچھ دل کی پاکیزگی کے لئے ایک طریقہ تھا۔ اب میں تھوڑا سا ضروری علم کی باتیں بتاؤں گا کہ آپ تمام اسماعیلیوں کو علم کی کن بنیادی باتوں کی ضرورت ہے، میں عرض کروں گا کہ ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ حضرت آدم علیہ السّلام سے انسانیت کی تاریخ جو شروع ہوئی وہاں سے لے کر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ تک اِس تاریخ کی کیا رفتار رہی اور دین کا جو قانون تھا یا جو شریعت تھی وہ کس طرح چلتی آئی، آیا وہ یکسانیت کے ساتھ چلتی آئی یا ہر پیغمبر کے زمانے میں اُس میں کچھ ترمیم ہوتی رہی، کچھ (amendments) ہو گئے، کچھ اصلاحات ہوئیں اور اُس میں کیا ہوا؟ یہ جاننا ہمیں بہت ہی ضروری ہے ۔ کیوں ضروری ہے؟ اِس لئے ضروری ہے کہ خداوندِ عالم نے قرآن کے اندر یہ حوالہ دیا ہے کہ اگر کسی کو میری سنّت و عادت کے متعلق دیکھنا ہے، سوچنا ہے تو دیکھو میری سنّت و عادت اگلے پیغمبروں کے زمانے میں گزر چکی ہے [۴۸:۲۳]۔ سوچیں ذرا اِس سے خدا کا مقصد کیا ہے؟ خدا ہم کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر آنحضرتؐ تک دینی قانون کا جو رواج رہا یا جو رفتار رہی یا اُس میں وقتاً فوقتاً ترمیمات ہوتی آئیں اُسی کو خداوند اہمیت دیتا ہے اور وہ یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ ہم ایسا سمجھیں کہ آنحضرتؐ کے بعد بھی وہی رفتار رہے گی، اللہ کی وہی عادت

رہے گی جو آگے گزر چکی ہے۔ اِس لئے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے قرآن کی روشنی میں کہ تھوڑا سا کہ آدم، نوح، ابراھیم، موسیٰ، عیسیٰ اور دیگر انبیاء علیھم السّلام کے زمانوں میں کیا ہوا۔

ہمارے لئے اِس کا جاننا اِس لئے ضروری ہے کہ آج ہم جس طرح نظریہ امامت کو اپناتے ہیں تو یہ آج کی بات نہیں ہے، جب کہ خدا نے یہ فرما کر سارے مطلب کو ختم کیا کہا کہ کوئی چیز نئی نہیں ہوگی وہی ہوگا جو آگے ہوا تھا، یعنی میری ایک مکمل سنّت یعنی میری سنّت کا جو کچھ پروگرام تھا وہ مکمل طور سے آگے ہو چکا ہے، گزر چکا ہے، اب اگر ایسا ہے تو اسلام میں یعنی رسول اللہؐ کے بعد کوئی نئی چیز دین میں کس طرح ہو سکتی ہے؟ اور اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ امامت کا نظریہ ایک نیا نظریہ ہے یہ بات صحیح نہیں ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ امامؑ خود فرماتے ہیں کہ دین قدیم ہے، نور ازل سے آیا ہے، امامؑ نے جب واضح طور سے فرمایا کہ میرا نور ازل سے ہے لیکن وقتاً فوقتاً جامہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ جامہ تبدیل ہوتا رہتا ہے [بمبئی، ۸۔۹۔۱۸۸۵ء] جب امامؑ نے یہ فرمایا تو اِس میں ہمارا یہ فرض ہے کہ انبیاء علیھم السّلام کی (history) میں ہم دیکھیں، قرآن کی روشنی میں دیکھیں کہ امامت آنحضرتؐ سے آگے کس طرح تھی اور کون امام تھے آدمؑ کے زمانے میں، نوحؑ کے زمانے میں، ابراھیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ کے زمانے میں امامت کا کیا حال تھا اور اُن اماموں کے کیا نام تھے یہ تو جاننا ہوگا، تو میرے اِس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ تک جو زمانہ گزرا ہے اُس کا جس مختصر طریقے سے قرآن میں ذکر ہے اُس کو جاننا چاہئے اور اُس کے بعد آنحضرتؐ کے زمانے میں جو کچھ واقعات ہوئے ہیں اُس کا جاننا ضروری ہے، کیوں؟ اِس لئے کہ ہمیں مذہب کے، اسلام کے (background) کو جاننا ہے، اسمٰعیلی مذہب کو بنیاد سے جاننا ہے، امامت کو جاننا ہے اِس سلسلے کے آنحضرتؐ کے زمانے کے۔ بہت سے حالات کو قرآن کی روشنی میں جاننا ہے۔

اِس کے علاوہ ہمیں یہ بھی جاننا ہے کہ مختلف زمانوں میں امامت کی روشنی میں اسمٰعیلی اسکالرز نے کیا کیا، یعنی اسماعیلیوں کے پاس کونسی کونسی کتابیں ہیں، بڑی بڑی کتابیں اور کن بزرگوں نے کیا کیا کام کیا اُن کو بھی تو جاننا چاہئے، یہ جاننا ضروری ہے اگر ہم اِس طرح سے سوچیں گے تو ہمارا جو (link) ہے یا جو (background) ہے وہ بہت ہی مضبوط ہوگا اور ہم کسی بھی موقع پر بات کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہم خانۂ حکمت کے (member) ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، دیکھیں کہ خانۂ حکمت، ہم نے اپنے اِس ادارے کا نام ایک علمی نام رکھا ہے، یہ بھی جاننے کا ہے کہ ہم نے اپنے اِس چھوٹے سے ادارے کا نام خانۂ حکمت رکھا ہے اور یہ بہت بڑا نام ہے۔ تواریخ میں دیکھیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے تو اِس لئے بھی ہمیں یعنی علم کی طرف توجّہ کرنی ہے۔ یہ سب کچھ مشکل نہیں ہے، یوں کہنے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم بہت ساری مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہمارے سامنے ایسے بڑے بڑے فرائض ہیں کہ ہم اُن کو انجام ہی نہیں دے سکتے ہیں، یہ بات نہیں ہے، مولا ہے مہربان اور آپ بہت اعلیٰ طریقے سے یہ کام کر سکتے ہیں، اِس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ عملدار اور ہر

کوئی جو ہے یعنی ایک دم سے اسکول، کالج کے بچّوں کی طرح پڑھنے لگیں، یہ بات نہیں ہے، جو آپ میں قابل افراد ہیں، جو جاننے والے ہیں، جن کا یہ کام ہے وہ یہ کام ضرور کریں۔ وہ یہ کام ضرور کریں، وہ (study) کریں، وہ پڑھیں اور سوالات کریں اور قرآن کلاس میں حاضری دیں، تو یہ کام آسان ہوسکتا ہے، جب تک آپ (practical) کام نہیں کریں گے تو دُوسروں کی مدد کس طرح کر سکتے ہیں اور جب مولا آپ پر مہربان ہے، جب آپ کے پاس وسائل ہیں اور آپ آپس میں (discuss) کر سکتے ہیں اور آپ کے پاس کتابیں ہیں، بہت کچھ ہے، بہت کچھ ہے اِس لئے جو (teacher) حضرات ہیں، جو (guides) ہیں، جو نوجوان ہیں جن کو آگے چل کر بڑے بڑے کام انجام دینے ہیں اُن کا یہ فرض ہوتا ہے، کہ وہ بڑے شوق سے اور احساسِ ذمّہ داری سے علم کے کام کو آگے بڑھائیں۔ آپ کے لئے مثال قائم ہوئی ہے جو آپ میں سے کچھ افراد لندن گئے ہوئے ہیں، کچھ کینیڈا گئے ہوئے ہیں، وہ بڑی ذمّہ داری کے ساتھ (courses) کر رہے ہیں تو عجب نہیں ہے کہ آپ کو بھی یہ موقع ملے، اِس لئے میری گزارش ہے کہ آپ قرآن کلاس اور دیگر علمی چیزوں میں مستعد رہیں۔ اب میں درمیان میں رُکتا ہوں اِس لئے کہ میں چاہوں گا کہ آپ میں سے کوئی عزیز کوئی متعلقہ سوال کرے تا کہ اِس سوال کے جواب دینے میں دلچسپی ہو اور اہلِ محفل کے لئے اِس سے فائدہ ہو۔

انہوں نے سوال کیا حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے ایک ارشاد کے حوالے سے کہ مولا نے فرمایا ہے کہ تمہارے پاس روغن ہے یعنی تیل، یعنی روغن پڑا ہوا ہے اور صرف اتنی بات ہے کہ تمہیں دِیا، سلائی جلا کے اُس کو روشن کرنا ہے لیکن تم اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتے ہو، یہ اِن کا سوال ہے [واڈھوان کیمپ، ۱۸، اکتوبر ۱۹۰۳ء]۔ اب جواب سنئے کہ یہ ارشاد قرآنِ مقدّس کی ایک آیتِ کریمہ کے مطابق ہے اور وہ آیتِ کریمہ سورۂ نور کی آیتِ نور میں ہے جہاں پر اِرشاد ہے کہ: ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ '' (۲۴:۳۵) اُس میں یہ ارشاد ہے کہ درخت زیتون کا تیل ہے تو اُس تیل کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ اگر آپ اُس کو آگ سے نہ چھوئیں، ماچس نہ بھی جلائیں تو وہ خود از خود روشن ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، تو یہ اُس رُوحانیت کی بات ہے جو امامؑ کے اندر ہے، لیکن امامؑ کے اِس ارشاد کے مطابق وہی رُوحانیت اس کے رُوحانی فرزندوں میں بھی ہے، وہی تیل، وہی رُوح، وہی رُوحانیت مومنین کے اندر بھی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں تو ماچس لگانی ہوگی، وہاں (automatic) تیل روشن ہو جاتا ہے، جلتا ہے لیکن یہاں ہمیں تھوڑی سی کوشش کرنی ہوگی یعنی امامؑ جس مقام پر ہے، وہ بہت ہی اعلیٰ مقام ہے، وہاں پر صرف اِرادے سے کُن فیکون سے کام چلتا ہے اور اُس کے مقابلے میں جو اُس کے مرید ہیں اور اُس کے جو رُوحانی فرزند ہیں اُن میں یہ صلاحیت ہے کہ تھوڑی سی کوشش کریں تو کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اِس کی مثال امامؑ نے یہ دی کہ تمہارے سامنے روغن، روغن تیل کو کہتے ہیں اور غالباً وہی زیتون کا تیل جس کا

قرآن میں ذکر ہے، پڑا ہوا ہے تم اس کو جلاؤ روشن کرو تو تمہارے باطن کے اندر نور، روشن ہو جائے گا اور روغنِ زیتون کہتے ہیں ، درختِ زیتون کا تیل، اِس کے اندر بہت زبردست تاویل ہے اور حاضر امامؑ نے کبھی کسی دیدار کے مقام پر، انڈیا میں یا کہیں جماعتوں سے پوچھا تھا یا تاکید کی تھی کہ زیتون کی کیا تاویل ہے تم اِس کو سمجھو اور یہ فرمان میں ہے [بمبئی، ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء] تو قرآن میں بھی زیتون کے تیل کی یہ اہمیت ہے، اِس لئے امام سلطان محمد شاہؑ نے جو تیل کہا تو اُس کی مراد روغن زیتون ہے، زیتون کا تیل۔ اب دُنیا کے اندر جتنا بھی تیل ملتا ہے اور خصوصاً زمانۂ قدیم کے مطابق اُس میں درختِ زیتون بہت ہی بابرکت ہے اور بہت ہی پُرحکمت ہے، تو اِس سے دیکھیں کہ ہمارے اندر جو رُوح ہے وہ مثال کے طور پر تیل ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم اپنی رُوح کو نور نہیں کہہ سکتے ہیں اور رُوح کہہ سکتے ہیں، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اِس کو تیل کہہ سکتے ہیں لیکن روشنی نہیں کہہ سکتے ہیں کیونکہ تھوڑا سا فرق ہے، کمی ہے اور اگر ہم رُوح کے اِس تیل کو جلائیں تو اُس میں سے شعلہ نکلے گا، شعلہ کا مطلب نور، روشنی اور ہم نے کسی کتاب کے اندر اِس کی مثال دی ہے شاید امام شناسی کے اندر آپ کو یاد ہوگا کہ جس طرح کسی چراغ کے اندر تیل ہوتا ہے، بتّی ہوتی ہے اور اُس بتّی کو کھینچ کے، اُبھار کے آگ لگائی جاتی ہے، تو وہ جلنے لگتا ہے اور روشنی ہوتی ہے، روشنی ہونے کے بعد اُس کا ایک شعلہ ہوتا ہے، (flaming)، پھر اُس کے بعد ایک پھیلی ہوئی روشنی ہوتی ہے ، تو روشنی دو قسموں میں ہوتی ہے ایک شعلے کی شکل میں ، ایک (disperse)، پھیلی ہوئی، تو امامؑ کے اندر جو پاک رُوح ہے وہ روغنِ زیتوں کی مثال ہے اور امامؑ کے اندر جو (action) میں نور ہے وہ (flame) ہے اور اِس کائنات کے اندر جو امام کی پھیلی ہوئی روشنی ہے وہ چراغ کی اُس روشنی کی مثال ہے جو کمرے کے اندر پھیل جاتی ہے۔ یہ مثال بہت عمدہ ہے، میں دوبارہ اِس کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، دیکھیں کاش کہ آپ اُس چراغ کو دیکھتے، وہ چراغ قدیم میں تھا، کبھی آپ نے موم بتّی کو دیکھا ہوگا یا یہ کبھی وہ (gas) کا ایک (lamp) بناتے ہیں اُس کو دیکھا ہوگا اُس کی مثال لیجئے تو (gas) کے (lamp) میں یا موم بتّی میں دو قسم کی روشنی ہوتی ہے، ایک پھیلی ہوئی روشنی، ایک شعلہ پھر بتّی اور پھر تیل، تو موم بتّی میں تو وہ ٹھوس تیل ہوتا ہے جسے موم کہتے ہیں اور چراغ میں تیل ہوتا ہے تو امام کے اندر بھی ایسی چند چیزیں ہیں، ایک امام کی شخصیت ہے وہ ظرف یعنی (pot)، برتن کی طرح ہے اور پھر امام کے اندر رُوح ہے جو تیل کی طرح ہے اور رُوح سے جو نور بنتا ہے، وہ شعلہ ہے اور اُس شعلے سے جو اِس کائنات کے اندر جو روشنی پھیلتی ہے وہ اُس پھیلی ہوئی روشنی کی طرح ہے جو کسی (lamp) سے یا کسی چراغ سے پھیل جاتی ہے، تو اسی سوال کے ضمن میں، میں نے تھوڑی سی وضاحت کی تا کہ اچھی طرح سے اِس کی وضاحت ہو، اچھا! اور کوئی جس طرح میرے عزیز الامین نے یہ سوال کیا اِس طرح کوئی سوال بھی ہو سکتا ہے۔

سوال: اِن میرے عزیز نے سوال کیا کہ خدا جسے چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور وہ جسے چاہتا ہے ذلّت دیتا ہے اور

پھر اسی طرح یہ بھی ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور خدا جسے چاہتا ہے گمراہ بھی کرتا ہے ۔ اِس میں اِن کا خاص سوال یہ ہے کہ جہاں انسانوں کو اختیار دیا گیا ہے اُس اختیار کے مقابلے میں اگر خداوند نے اپنے اختیار کو استعمال کیا تو پھر انسانوں کا جو اختیار ہے وہ نیست اور نابود ہوگیا، پھر اِن کا کوئی اختیار نہیں رہا کہ خدا نے اپنی مرضی سے کسی کو ہدایت دی اور اپنی مرضی سے کسی کو گمراہ کر دیا، تو پھر اِس کا (blame) انسان پر کیوں آنا چاہیئے، وغیرہ ۔ ایسے بہت سے ذیلی طور پر سوالات اُبھرتے ہیں اور اسی طرح قرآن کے اندر یہ بھی ہے کہ: ''خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۲:۷) خدا نے اُن کے دلوں پر مہر لگائی، اُن کے کانوں پر بھی مہر لگائی اور اُن کی آنکھوں پر پردے کئے، اگر خدا کسی کے دل پر مہر لگاتا ہے اور جس کے نتیجے میں کوئی شخص سمجھنے اور سننے اور سوچنے کے قابل ہی نہیں رہتا چونکہ خدا نے اُس کو (condemn) کر دیا اور خدا کسی کے کان میں مہر لگاتا ہے کہ اُس کی سماعت کو ختم کر دیتا ہے اور خدا کسی کی آنکھوں پر پردہ ڈالتا ہے اور جس کے نتیجے میں وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا ہے تو پھر گناہ کے متعلّق پوچھ گچھ اور سوال کیوں ہونا چاہیئے؟ ایسے سوالات پیدا ہو سکتے ہیں، تو یہ میں نے تین باتیں اِن کے اِس سوال کے (add) میں کیا۔

اب میں اِس کے جواب کی طرف جاتا ہوں وہ یہ کہ دیکھیں یہ دو باتیں ہیں اِس میں، خدا اِس کے بغیر یہ کہہ سکتا ہے کہ اُس نے (touch) کیا ہمارے اختیار کو، متاثر کیا اُس کے کہنے کی وجہ ہے، اُس نے جو (source) دیئے ہیں یعنی جو اختیار دیا ہے ہم اُس اختیار کو اپنے دائرے کے اندر، اختیار کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کائنات کے مالک ہیں اور ہمارا اختیار جو ہے اِس پوری (universe) پر محیط ہے، یہ بات نہیں ہے، اختیار کا یہ مطلب ہے کہ جو فرائض ہمارے سامنے ہیں اور جن کاموں سے ہمارا تعلّق ہے اُن کے دائرے کے اندر ہم کو (freewill) کی صلاحیت دی گئی ہے ۔ ابھی ابھی (london) کے جو نامور (student) ہیں اُن کے درمیان (predestination) اور (freewill) کے بارے میں یعنی قضا و قدر اور انسان کے مختار ہونے یا مجبور ہونے کے سلسلے میں بہت لمبا (discuss) ہوا تھا، اُس میں بھی یہ باتیں ہوتی رہیں، تو میں کہہ رہا ہوں کہ دیکھئے، خداوندِ عالم نے کچھ مخلوقات پیدا کیں، مثال کے طور پر فرشتوں کو پیدا کیا تو اُن کو (automatic) نیکی کی طرف مجبور کر دیا اُن کو کوئی اختیار نہیں دیا، اُن کو (choice) نہیں دیا، وہ بالکل مجبور ہیں نیکی کی طرف جو انسان سے اُوپر ہے، پھر انسان سے نیچے ایک مخلوق کو پیدا کیا جو جانور ہیں اُن کو فساد، بگاڑ اور شر کی طرف خدا نے مجبور کر دیا، اِن دونوں سے کوئی حساب کتاب نہیں ہے کیونکہ حساب کتاب اُن پر ہے جن کو اختیار دیا گیا ہے، تو فرشتوں کو جو اختیار نہیں ہے، جانوروں کو جو اختیار نہیں ہے وہ فرشتے نیکی کی طرف (automatic) جا رہے ہیں، یہ جانور جو ہیں وہ فساد اور بگاڑ کی طرف جا رہے ہیں تو اِن دونوں پر کوئی (blame) نہیں ہے، کوئی اِن کو بہشت نہیں، کوئی اِن کو دوزخ نہیں، کوئی حساب نہیں، کوئی کتاب نہیں ۔ اب انسان کو دیکھیں یہ درمیان میں ہے ، اِس کے اندر دو عنصر ہیں، دو

(elements) ہیں، فرشتگی کے ہیں اور حیوان کے ہیں یعنی عقل ہے تو یہ فرشتہ ہے اور نفس ہے تو یہ حیوان ہے لیکن دونوں چیزیں ہیں نفس چاہتا ہے کہ حیوان بنے، عقل چاہتی ہے کہ فرشتہ بنے، اب خدا کو چاہئے کہ اِن دونوں کے اُوپر کوئی اور تیسری قوت دے تو وہ ہے اختیار۔

اختیار عربی لفظ ہے، (root) ہے اِس کی خیر ہے اور چند چیزوں میں سے یا دو چیزوں میں سے کسی ایک کو (select) کرنا، (choice) کرنا یہ اختیار ہے، تو یہ صلاحیت انسان کو دی گئی اِس کے دینے کے بعد پھر خدا اپنی طاقت کو وقت سے پہلے کسی پر مسلّط نہیں کرتا ہے اور جو چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ اُس نے کسی کو گمراہ کیا، جو چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ اُس نے کسی کو ہدایت دی، مگر اِس میں خدا سے نہ کوئی پوچھنے کی صورت بنتی ہے اور نہ اختیار کے چھن جانے کا کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے اِس لئے کہ خدا صرف فعل کو (adopt) کرتا ہے، بغیر خود کئے خود نہیں کرتا ہے، بندہ کرتا ہے لیکن چونکہ خدا کے وسیلے سے ہے اور ایک اختیار کے تحت ہے لہٰذا چونکہ وہ بادشاہ ہے اِس کو (adopt) کرتا ہے، فعل کو (adopt) کرسکتا ہے۔ اِس کی مثال میں نے کئی دفعہ یہ دی تھی کہ مثلاً کوئی بادشاہ ہے بڑا سا، اُس نے وزیرِ اعظم سے یہ کہا کہ فلان جو بیابان/ (desert) ہے اُس کو آباد کراؤ، وزیرِ اعظم نے دوسرے درجے کے (minister) کو کہا کہ بادشاہ کا یہ حکم ہے کہ فلان جو صحرا ہے اُس کو آباد کرو اور (minister) نے پھر دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو کرتے کرتے نیچے ٹھیکیدار تک یہ حکم آگیا، تو ٹھیکیدار نے کچھ مزدوروں کو کچھ ملازموں کو کچھ (public) کو جمع کرکے وہاں ایک نہر تعمیر کروائی اور کچھ عرصے کے بعد وہاں ایک شہر آباد ہوگیا۔ شہر آباد ہونے کے بعد بادشاہ تک یہ (report) واپس چلی گئی تو بادشاہ نے اعلان کیا فخر سے فخریہ انداز سے اور کہا کہ میرے باپ دادا نے اِس بیابان کو آباد نہیں کیا تھا میں نے یہ آباد کیا۔ اب دیکھیں کہ وہ کتنا دُور ہے اِس (action) سے، فعل سے لیکن وہ (adopt) اِس لئے کرسکتا ہے کہ یہ سب کچھ اِس کے (under) میں ہو رہا ہے، بغیر اِس کے کہ وہ آکے مزدوروں کے ساتھ ملے اور کام کرے، بغیر اِس کے کہ وہ جو مزدوروں پر جو حکم کرنے والا ہے وہ حکم کرے وہ بہت بلند و بالا رہتے ہوئے، چونکہ بادشاہی کا جو قانون ہے کہ سب کچھ اِس کے تحت ہو رہا ہے، لہٰذا اس فعل کو (adopt) کرکے کہہ سکتا ہے کہ میں نے یہ کام کیا اور یہ غلط نہیں ہے، صحیح ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارا جو اختیار ہے بحال ہے اور خدا کہہ سکتا ہے کہ اُس نے کسی کو گمراہ کر دیا اور اُس نے کسی کو ہدایت دی تو مطلب یہ ہے کہ انسان نے خود کو گمراہ کیا اور انسان نے جو خدا نے صلاحیت دی تھی اُس سے فائدہ اُٹھا کر ہدایت پائی تو اِدھر یہ بحال ہے اور اُدھر خدا کہتا ہے کہ اُس نے کیا، اِس کی مثال یوں ہے۔ لیکن اِس مطلب کو لوگ نہیں سمجھتے ہیں اور جو نہیں سمجھتے ہیں اِس بُری طرح سے پھنسے ہوئے ہیں کہ پھر اِس کی وجہ سے تقدیر کو ماننے لگتے ہیں کہ (predestination) ہے، خدا نے چاہا ہے اُس کی طاقت اس کی مشیت مسلّط ہے، اور (by-force) یہ سب کچھ کر رہا ہے، اگر خدا ہمارے اختیار کے درمیان میں آتا ہے اور سب

کچھ وہی کرتا ہے تو پھر وہ خود ہی جواب دہ ہے، کل کو اور پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کچھ لوگوں کو وہ مجرم ٹھہراتا ہے اور جہنم میں جھونک دیتا ہے اور کچھ کو بہشت میں رکھتا ہے، نہیں! اُس نے وسائل دیئے ہیں جو شیطان ہے وہ بھی اُس سے بہت دُور نیچے ہے اور جو ہدایت کا سرچشمہ ہے وہ بھی، تو یہ سب کچھ بندوبست اور ذرائع، وسائل، اسباب اور ہر چیز ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر صحیح ہے اِس کے باوجود خدا کہہ سکتا ہے کہ میں نے کیا، وہ بادشاہت کے قانون کے تحت کہتا ہے، بادشاہت یعنی سلطنت کی رُو سے کہتا ہے، خود فعل کر کے خود (action) کر کے نہیں، یہ نہیں۔

اب یہ اتنا مشکل مسئلہ ہے کہ لوگوں نے اِس کو نہیں سمجھا اور اِس کو ماننے لگے کہ تقدیر کوئی چیز ہے۔ میں نے اُس بحث میں یا (discuss) میں وہ ایسی بحث نہیں تھی، وہ صرف سوال تھا بات چیت اِس طرح سے ہو رہی تھی تو میں نے اُن کو کہا کہ ایک تو ہے علمِ خدائی، علمِ خدائی۔ خدا کے علم میں ہر بات واضح تھی خدا نے ہم کو صلاحیت دی اور کام کو ہمارے اُوپر چھوڑا لیکن وہ اپنے علم سے ہمارے انجام کو جانتا تھا اُس کے اِس جاننے سے ہمارے اُوپر کچھ اثر نہیں پڑتا ہے، وہ جانتا ہے لیکن جاننے کے ساتھ ساتھ اُس نے ہر قسم کی صلاحیت ہم کو دے دی، تو اِس کے علمِ غیب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اِس کی چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ کوئی (teacher) ہے، (examiner) ہے یا کوئی (profressor) ہے یا کوئی (master) ہے اُس کے (under) میں چند (students) تعلیم پا رہے ہیں، وہ بڑے انصاف سے پیار سے اور کوشش سے سب کو پڑھاتا ہے اور (exam) کا وقت آیا تو وہ جانتا ہے کہ کون اِس میں کمزور ہے اور کس کے کتنے نمبر آئیں گے، کیا اِس کے اِس جاننے سے اُن کے امتحان میں خلل پڑے گا اور اُن کو اِس کے جاننے کی وجہ سے (weakness) ہو گی یا اُن کو کچھ قوت ملے گی، نہیں ملے گی، قوت اسی سے ملے گی جو اُس نے اُن کو سکھایا ہے اور جو اِس کا (guess) کرنا یا قبل از وقت جو جاننا ہے یہ خالص چیز ہے جو اِن کے اِس اختیار کو (effect) نہیں کرتا ہے، تو اسی طرح علمِ الٰہی یعنی خدا کا جو علم ہے یا تو اِس کو لوگوں نے قسمت اور تقدیر سمجھا، یہ قسمت اور تقدیر نہیں ہے اور میں جو اَب بات کرتا ہوں وہ فرمان کے حوالے سے ہے کہ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے کسی ارشاد میں یہ فرمایا ہے کہ علمِ الٰہی/خدا کا علم صحیح ہے، خدا کا علم جو ہے وہ جانتا تھا کہ انسانوں کا انجام کیا ہو گا لیکن اِس کے باوجود خدا نے جس حد تک انسان کو اختیار دینا چاہئے اُس نے دے دیا ہے لیکن ایک مخصوص دائرے کے اندر اختیار دیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ساری خدائی جو ہے وہ انسان کے بس میں ہے یہ بات نہیں ہے، وہ آسمان تک اپنے اختیار کو نہیں چلا سکتا ہے، دائرۂ کار جو ہے، وہ جو (circle) ہے ایک اپنے فرائض سے متعلق اُس (circle) کے اندر انسان کو اختیار حاصل ہے، تو اِن عزیز نے خدا کے ارادے کے بارے میں مشیت کے بارے میں کہا تھا اور ایک پوائنٹ اور رہ گیا ہے، میں نے کسی مقام پر یہ (discuss) کیا ہے یا وضاحت کی ہے، ہمیں جاننا چاہئے کہ خدا کا اختیار کیسا ہے؟ ہم کو جو خدا شناسی کا فرض ہے خدا کو پہچاننے کے سلسلے میں تو اُس

میں خدا کی صفات کو (attributes) کو جاننا چاہئے اور اسی ضمن میں اسی سلسلے میں خدا کے ارادے بھی جاننا چاہئے کہ خدا کا ارادہ کیسا ہے؟ آیا خدا کا ارادہ انسان کے ارادے کی طرح ہے؟ ہمارے ارادے کی طرح ہے جو لغزش کھاتا ہے کبھی نفس کے اثر کو قبول کرتا ہے جو غصّے میں آتا ہے، کبھی ہمارا ارادہ عقل کے زیرِ اثر آ کر تھوڑی سی سنجیدگی کو اختیار کرتا ہے، تو کبھی کسی کا لحاظ کرتا ہے، کبھی کسی سے ناراض ہوتا ہے تو آیا خدا کا جو ارادہ ہے وہ بھی ایسا ہے؟ اگر نہیں تو وہ کیسا ہے۔ خدا کا ارادہ (law of nature) ہے، قانونِ فطرت، قانونِ قدرت کے ساتھ خدا کا جو ارادہ ہے وہ (attached) ہے، وہ (automatic) ہے۔ مثال کے طور پر میں آگ میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو لازمی بات ہے کہ کرامت نہیں ہوگی، ہاتھ جل جائے گا، خدا نے میرا ہاتھ تو نہیں جلایا، میں نے خود اپنے ہاتھ کو جلایا، خدا نے آگ کو جو (nature) دی تھی وہ (nature) اُدھر ہے۔ مجھے جاننا چاہئے تھا، ایسا نہیں ہوا کہ جس طرح دُنیا کے اندر کوئی مجھ سے ناراض ہو کہ مجھ سے انتقام لینا چاہتا تھا اور انتقام لیا یہ بات نہیں ہے، خدا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے چاہا کیونکہ خدا کا جو قانون ہے وہ (automatic) ہے، (nature) کے ساتھ اور کوئی دریا میں چھلانگ لگاتا ہے تو ڈُوب جاتا ہے، کوئی زہر کھاتا ہے تو مر جاتا ہے کیونکہ (nature) ہے اور ہر چیز کے اندر ایک خاصیت ہے اور کوئی شخص تلوار کو غلط استعمال کرتا ہے تو اُس کا ہاتھ اور پاؤں اور جسم کٹ جاتا ہے اور کوئی اچھا کام کرتا ہے تو وہ اچھا کام کرتا ہے اُس کا اچھا (result) پاتا ہے، یہ (law of nature) جو ہے وہ خدا کی مشیت ہے۔

اب آ گئے مزید وضاحت کے لئے کہ جس کو غلط کام سے گمراہ ہونا چاہئے اور جس کو صحیح کام سے ہدایت ملنی چاہئے، تو اسی پوائنٹ پر (interpret) کرتا ہے خدا، خدا کہتا ہے کہ میں نے کیا، میرے قانون نے کیا، میرا قانون جو (settle) تھا، جو (set) تھا اِس کے مطابق ہوا تو میں نے کیا اور اِس کے باوجود خدا پر کوئی (blame) نہیں آتا ہے، چونکہ اُس نے ایک قانون بنایا ہے اور وہ اُس قانون سے بالاتر ہے، اُس قانون کے اندر یعنی اُس کو ظلم نہیں چھوتا ہے، ناانصافی اُس کو نہیں چھو سکتی ہے اور عدل بھی اُس کو نہیں چھو سکتا ہے، کیوں؟ عدل اور ظلم ایک دُوسرے کے (opposite) میں نیچے نیچے ہیں، خدا عدل سے بھی اور ظلم سے بھی اُوپر ہے، تو یہ سب کچھ بہت نچلی سطح پر ہوتا ہے اور جو عدل ہے یا جو ظلم ہے وہ (nature) کے قانون کے تحت ختم ہو جاتے ہیں تو اِس کے باوجود خدا جو کہتا ہے میں نے کیا تو یہ خدا کا کرنا جو ہے یعنی اِس طرح سے نہیں ہے، خدا فاعل نہیں ہے، خدا (actor) نہیں ہے، خدا یعنی کام نہیں کرتا ہے، خدا کام نہیں کرتا ہے، خدا بادشاہ ہے لیکن (adopt) کر سکتا ہے۔ جس طرح ابھی میں نے مثال دی دُنیا کا کوئی بادشاہ کام نہیں کرتا ہے لیکن اِس کے باوجود کہہ سکتا ہے کہ میں نے کیا، صحیح ہے اُس نے (command) سے کیا، حکم سے کیا، حکم سے کرایا اور کیا اور اِس کے باوجود یعنی اُس نے کوئی ظلم نہیں کیا، انصاف سے کام ہوا اور جہاں غلطی ہے وہاں غلطی ہے، جہاں ظلم ہے وہاں ظلم ہے، تو

اِس کے باوجود خدا اُس کو ایک صاف اور پاکیزگی کے ساتھ کسی بھی کام کو (adopt) کرسکتا ہے، وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے، میں نے اُن کے دل پر مہر لگائی ایسا نہیں ہے کہ اُس نے مہر لگائی، قانون نے مہر لگایا اور وہ بالکل حق کے ساتھ مہر لگ گئی کہ لوگوں نے غلط کام کیا، ایک وقت ہے دل کے اندھے ہونے کا تو کام کرتے کرتے کرتے ایک وقت میں دل اندھا ہو جاتا ہے تو سمجھ لو کہ خدا نے مہر لگائی کیونکہ خدا کا جو قانون ہے، جو عدل سے، جو انصاف سے پُر ہے تو خدا کے قانون کو ظلم اور عدل نہیں چھو سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ وضاحت اچھی ہے اور اِس کو یاد کرنا چاہئے اور مزید اگر اِس میں کوئی سوال ہے تو ہو سکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کوئی سوال نہیں ہے۔

انہوں نے کہا عید منانے کے سلسلے میں کہا کہ چاند رات کے حساب سے ہم عید نہیں مناتے ہیں جو (general) اسلامی حکومت کے حساب سے عید مناتے ہیں، تو یہ ایک موافقت ہے، سازگاری ہے اور اختلاف کو کم کرنے کا ایک نظریہ ہے اور چونکہ عید منانا جو ہے وہ ہمارے بنیادی اُصولات میں سے نہیں ہے، وہ ایک ذیلی، ضمنی چیز ہے۔ لہٰذا اگر یہ ہمارے بنیادی اُصولات میں سے کوئی چیز ہوتی تو ہم ہرگز اُس کو اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیتے، لہٰذا وہ ایک (general) اسلامی چیز ہے جس میں سب مسلمان یکسان ہیں، لہٰذا اُس میں ہمیں گنجائش ہے کہ دُوسروں کے ساتھ مل کر منائیں اور رمضان عید کی کیا تاویل ہے یہ کتابِ وجہ دین میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے جو یہ سب (student) اُس کو پڑھتے ہیں، مختصراً یہ کہ رمضان عید جو ہے وہ قائم القیامت کی تاویل ہے وہ امام کے ایک درجے تک پہنچنے اور اُس کو پانے کی تاویل ہے اور اساس، اساس تک رُوحانی طور پر کوئی رَسا ہو جاتا ہے، پہنچ جاتا ہے، (approach) کرتا ہے اُس کی تاویل ہے اور اُس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو مومن اساس کے مرتبے کو پائے تو اُس کے بھیدوں کو محفوظ رکھنا چاہئے اور یہ روزے کی تاویل ہے، تو آپ اُس کتاب وجہ دین کو پڑھیں تو اِس زبانی سوال سے زیادہ آپ کو وہاں مل سکتی ہے اور کوئی بھی چیز (writing) میں آگئی ہے تو وہ بہت اچھی بات ہے اور وہ تقریباً (general) اور بہت عام بات ہے۔

یہ دیکھنا ہے کہ شیطان، انہوں نے سوال کیا کہ اگر فرشتوں کو اختیار نہیں ہے، (automatic) ہیں تو پھر یہ کس طرح واقعہ پیش آیا کہ شیطان بھی پہلے فرشتہ تھا اور اُس سے یہ گناہ کا ارتکاب ہوا نافرمان ہو گیا، اِن کا یہ سوال ہے۔ اِس سوال کے جواب میں یوں کہنا ہے کہ یہی بات ابھی ابھی لندن کی بحث میں بھی آئی تھی، اب یہ دیکھنا ہے کہ شیطان اگر فرشتوں میں سے تھا تو وہ کس درجے کے فرشتوں میں سے تھا، آیا وہ جلالی فرشتوں میں سے تھا، آیا وہ بالفعل جو فرشتے ہیں اُن میں سے تھا یا بالقوہ جو فرشتے ہوتے ہیں اُن میں سے تھا، یعنی آپ فلسفے کی اصطلاح میں جائیں تو چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں کچھ چیزیں جو ہوتیں ہیں وہ (potentially) ہوتی ہیں، بحدِّ قوت، عربی میں اُس کو حدِّ قوت کہتے ہیں اور دوسری چیزیں جو ہوتیں ہیں وہ (actually) ہوتیں ہیں، اِس میں کیا فرق ہے (potentially)۔

درخت کا ایک بیج ہے تو اُس بیج کے اندر جو قوت ہے وہ (potentially) ایک درخت ہے (actually) درخت نہیں ہے، (actually) درخت وہ ہے جو درخت ہے ۔ مرغی کے ایک انڈے کو لیں تو اُس کے اندر (potentially) ایک مرغی ہے، (actually) نہیں ہے، (actually) وہاں ہے جہاں مرغی ہے۔ اسی طرح آپ ہم اور دُوسرے جو ہیں وہ (potentially angles) ہیں (actual) نہیں ہیں اور اگر قرآن میں ابلیس اور اُس کے مومنین کو اور اُس کے ساتھیوں کو فرشتے کہا گیا ہے تو اُس میں یہ دیکھنا ہے کہ وہ لوگ رُوحانیت کے فرشتے تھے یا جسمانیت میں امام کے مرید تھے یا اگر مرید تھے تو وہ (potentially)، (angles) تھے۔ اب اِس موقع پر میں ایک فرمان کا (reference) دیتا ہوں کہ حضرت امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ زمانۂ آدم میں جو مومنین تھے وہ جسم سے انسان تھے اور روح سے فرشتے تھے [کچھ مندرا، ۲۳۔ ۱۱۔ ۱۹۰۳ء] تو یہ بات ہوگئی (potentially) ایسے فرشتے نہیں تھے جو کہ نفس اور جسم سے الگ تھلگ ہوتے ہیں لطیف جلالی فرشتے، پھر مولا نے فرمایا کہ مولا علیؑ کے زمانے میں بھی جو مومنین تھے وہ جسم میں انسان تھے اور روح سے فرشتے [کچھ مندرا، ۲۳۔ ۱۱۔ ۱۹۰۳ء]۔ اب بات سامنے آ گئی کہ زمانۂ آدم میں جو فرشتوں کی بات ہے وہ کچھ مرید تھے، وہ کچھ لوگ تھے تو مطلب یہ ہے کہ ابلیس کو فرشتہ اُس پہلو سے اُس عنصر سے کہا جا سکتا تھا لیکن اِس عنصر سے نہیں کہ وہ درمیان میں تھا کسی چیز کے دو نام ہیں آپ کے نزدیک تو یہ آپ کو اختیار ہے کہ چاہے اُس نام سے پکاریں، چاہے اِس نام سے اور ابھی کوئی مومن ہے تو آپ اُس کے ایمان کو عقل کو دیکھیں تو فرشتہ ہے اور نفس کو دیکھیں تو انسان ہے، آپ جو محبّت کے جذبات سے یا ایمان سے، ایمان کے جذبات سے بھر پور ہوتے ہیں آپ جب اُس پہلو کو لیتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ فرشتے ہیں لیکن ہمیشہ تو نہیں کہہ سکتے ہیں چونکہ نفس بھی تو ہے۔ اِس طرح اُس زمانے میں جو آدم کے مرید تھے اُن لوگوں کو اُس عقل کے پہلو سے فرشتے کہا گیا اور اگر وہ خالص فرشتے ہوتے جن کے متعلّق قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ فرشتے ہرگز نافرمانی نہیں کرتے ہیں، کتنی آیتیں ہیں آپ چاہیں تو میں آپ کو بتاؤں گا، وہ (formula) کے طور پر ہیں اُن آیات میں کہا گیا ہے کہ فرشتے کبھی نافرمانی نہیں کرتے ہیں تو پھر یہ اگر فرشتہ تھا تو قرآن کے خلاف کیوں؟ قرآن بھی تو خدا کا کلام ہے، بات یہ ہے کہ وہ فرشتہ اور انسان کے درمیان تھا، لہٰذا اِس عنصر کا زیادہ زور ہوا اور یہ اُس سے نافرمانی ہوئی۔ یہ بات اکثر و بیشتر ہماری مجالس میں ہوتی رہی ہے کہ وہ جلالی فرشتے نہیں تھے، جن فرشتوں کا ذکر آدم کے قصّے میں آتا ہے وہ بڑے بڑے فرشتے نہیں تھے، یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا نے کبھی فرشتوں کو پیدا کیا تھا اور آدم کے پیدا کرنے تک وہ لاعلم تھے خدا کے نام تک نہیں جانتے تھے، جس طرح کہ اِس قصّے سے ظاہر ہے، نہیں! یہ فرشتے جو آدم سے (concern) ہیں وہ دو قسم کے ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اُس کے زمانے کے مرید ایک یہ کہ اُس کے اندر جو لاتعداد ذرّات ہیں ہم اِس کو بار بار بتاتے ہیں کہ انسان کے اندر ایک دُنیا ہے اُس کا نام عالمِ ذرّ ہے، عالمِ ذرّ

انفرادی دُنیا کا قصّہ ہے۔

کل کو دو برس کے بعد آپ پر رُوحانیت کے واقعات گزریں گے تو وہی کیفیت آپ پر گزرے گی آپ باور کریں گے کہ آپ کے اندر کتنے فرشتے ہیں، وہ پیشانی سے سجدہ نہیں کرتے ہیں یہ تاویلی سجدہ ہے، یہ تابعداری ہے، تو بہر حال یہ واقعہ آدم کی ذات میں ہوا اور بیرونی کائنات کا ساتھ اِس کا (concern) نہیں ہے، یہ ''کُلُّھُمْ'' (۳۸:۷۳) سے مراد یعنی ہم ''کُلُّھُمْ'' کو اِس مجلس میں بھی استعمال کر سکتے ہیں، سب، یہ سب کا لفظ ایسا لفظ ہے کہ کبھی کائنات بھر کے لوگوں کے لئے استعمال ہوگا اور یہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ سب سے مراد ہم جب ہمارا موضوع یہ ہے ہم اِن ہی سے بات کرتے ہیں تو سب کا لفظ اِس کو استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ اُس قرآن کے اندر ''کُلُّھُمْ'' ہے تو اِس سے لوگ گمان کرتے ہیں کہ ساری کائنات بھر کے فرشتے، نہیں! ''کُلُّھُمْ'' جو آدم کے سامنے تھے وہ ''کُلُّھُمْ''، تو بہر حال یعنی فرشتگانِ جلال، اور اِس میں یہ کہنا بھی ہے کہ آپ فرشتوں کے موضوع میں جائیں گے تو اُن کے اندر کچھ تو ''حَمَلَةِ العَرش'' ہیں عرش کے اُٹھانے والے ہیں اور پھر جبرائیلؑ ہے، میکائیلؑ ہے، اسرافیلؑ ہے، عزرائیلؑ ہے اور بہت سے عظیم فرشتے ہیں اِن سب کو اُس مضمون میں ہم نہیں لا سکتے ہیں، لہٰذا ابلیس بحدِّ قوت فرشتہ تھا۔

ٹرانسکرائب: شمع گیلانی ٹائپنگ: ثناء وزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی قس کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: توریت اور انجیل کا مقصد = ہدایت اور نور

کیسٹ نمبر: ۶۹ تاریخ: جولائی ۱۹۸۲، کراچی

عزیزانِ من! اِس دُعا کے بعد میری خواہش ہے کہ قرآنِ مقدّس کی کوئی حکمت بیان کرنے کے لئے کوشش کی جائے اور یہاں پر ایک آیۂ کریمہ ہے، میرے خیال میں اِس میں بہت اہم باتیں ہیں اور اِس حکمت کے اندر آسمانی کتابوں کے بارے میں بحیثیتِ مجموعی کچھ اِرشاد ہوا ہے، کوئی اُصول بیان ہوا ہے، کہ آسمانی کتابیں جب بھی نازل ہوئیں تو اُن کا مقصدِ اعلیٰ کیا ہوتا تھا، یہاں تورات، انجیل اور اُس کے بعد قرآنِ مقدّس کو لیا گیا ہے، کہ اِن عظیم آسمانی کتابوں کے نزول کا خدا کے نزدیک کیا مقصد تھا، اِس کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینا ہے۔ ویسے تو کسی بھی الہامی کتاب کا ایک مقصد نہیں ہوتا ہے، اُس کے اندر مختلف مقاصد ہوتے ہیں، بہت سے مقاصد ہوتے ہیں مگر اُن تمام مقاصد میں ایک مقصد سب سے بڑا ہوتا ہے اُس کو آپ عظیم ترین مقصد کہیں یا کہ مقصدِ اعلیٰ کہیں اور اِس مقصدِ اعلیٰ کے تحت جتنے بھی مقاصد آئے ہیں اُن سب کا مجموعی مقصد وہی ہوتا ہے جو مقصدِ اعلیٰ ہے۔ چنانچہ اِس آیۂ مبارکہ میں تورات کے نزول کا مقصد بیان ہوا ہے اور وہ اِس طرح سے ہے:

”بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرَاةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ“ (۵:۴۴)

خدائے جلیل وجبّار کا ارشاد ہے، جو فرمایا گیا ہے کہ ہم نے تورات نازل کیا اور اُس میں ہدایت اور نور تھا جس کو انبیاء علیہم السّلام بیان کرتے تھے اُن لوگوں کو جو اسلام لے آئے تھے یہود میں سے اور ربّانیون اور علماء یعنی درویش اور علماء، اِن سب کو وہ بیان کرتے تھے تورات کی وضاحت کرتے تھے کیونکہ اُن انبیاء علیہم السّلام کو کتاب محفوظ تھی، اُن کے سامنے، اُن کے دل و دماغ میں، اُن کے ظاہر میں اور اُن کے باطن میں اور کیونکہ وہ اُس پر گواہ تھے، اِس لئے انبیا علیہم السّلام ہی آسمانی کتاب کو بیان کرتے تھے، کوئی اور نہیں، یہ اِس آیۂ مبارکہ کا مختصر ترجمہ ہے۔ اب ہم اِس کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، سب سے پہلے جو ارشاد ہوا کہ تورات نازل ہوئی تھی اُس میں ہدایت اور نور تھا۔ اِس کا ہم تجزیہ کرنا چاہتے ہیں کہ اِس کا کیا مطلب کہ

تورات میں ہدایت تھی اور نور تھا، ہدایت کون سی اور نور کس قسم کا؟ نیز سوال یہ ہے کہ ہدایت اور نور کے آپس میں کیا ربط ہے اور یہ سوال بھی کہ پہلے ہدایت کا ذکر آیا اور اُس کے بعد نور کا حالانکہ عام نگاہ سے دیکھا جائے، تو جہاں پر نور ہے، تو اُس میں ہدایت بھی ہے اور ہدایت کے نُور سے الگ ہونے کے کیا معنیٰ؟ جب ہم اِس مقام پر ایسے سوالات کو اُجاگر نہیں کریں گے تو حکمت ہماری نگاہوں سے چھپی رہے گی۔ اِن سوالات کے لئے خلاصہ یہ ہے کہ تورات میں جتنے ذیلی مضامین تھے وہ اِن دو بڑے مضامین کے اندر تھے، یعنی تورات کا کُل مقصد ہدایت اور نور تھا۔ ابھی آپ دیکھیں کہ الفاظ کے اندر ترتیب ہوتی ہے یا ربط ہوتا ہے، ترتیب اِس چیز کا نام ہے کہ پہلے کون سا لفظ آتا ہے اور دُوسرے نمبر پر کون سا لفظ آتا ہے۔ اِس کا مقصد ہے، وہ مقصد یہ ہے کہ آپ ذرا غور کریں گے، تو بات اچھی طرح سے سمجھ میں آئے گی کہ یہاں جس ہدایت کا ذکر ہوا ہے وہ ہدایت نور کی طرف جاتی ہے اور نور بھی ہدایت ہے لیکن وہ (second stage) کی ہدایت ہے، مطلب اِس کا یہ ہوا کہ نور سے پہلے بھی کوئی ہدایت چاہیئے۔ اِس کا خلاصہ یہ ہوگا کہ تورات میں ہدایت تھی نور کو پانے کے لئے، نور کو پانے کے لئے، نور کو حاصل کرنے کے لئے تورات میں ہدایت تھی، کتاب کے اندر زندہ نور تو نہیں ہوتا ہے مگر نور کا ذکر ہوتا ہے، نور کا بیان ہوتا ہے۔ آپ کوئی مضمون لکھیں یا کتاب لکھیں تو سورج کا ذکر تو کر سکتے ہیں لیکن سورج کو کتاب میں قید نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ سورج اِن مادّی چیزوں میں سے ایک ایسی چیز ہے کہ وہ رُوح کے قریب ہے۔ اُس میں حرکت ہے، اُس میں روشنی ہے، اُس میں حرارت ہے، اُس میں تپش ہے، اُس میں طوفان ہے، اُس میں آواز ہے اور (action) ہے، ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کو آپ تحریر میں بند نہیں کر سکتے، بیان اور ہے چیز اور ہے۔ سورج تو سورج ہے، آپ اپنے کسی خط میں گلاب کے پھول کا ذکر کرتے ہیں تو کس طرح رنگ برنگے اور خوشبو کو وہاں کس طرح بسائیں گے، رنگ کی ترجمانی بھی تو لفظ میں کریں گے کہ گلاب کا جو پھول ہے وہ سُرخ ہوتا ہے اور یہ بھی کہیں گے کہ وہ بہت عمدہ پھول ہوتا ہے اور اُس میں عطر ہوتا ہے، خوشبو ہوتی ہے، آپ نے خوشبو کا ذکر کیا لیکن اپنے زورِ قلم سے خوشبو کو پیش نہیں کر سکے۔

اِسی طرح تورات میں نور تھا سے کیا مُراد ہے یعنی نور کا ذکر تھا اور تورات کی ساری ہدایت اُس نور کو پانے کے لئے جارہی تھی۔ ویسے تو میں نے جیسا ابھی کہا کہ تورات کے اندر بہت سارے مضامین تھے لیکن سب سے بڑا جو مضمون تھا یا جو مقصدِ اعلیٰ تھا وہ دو حصّوں میں تھا، ایک ہدایت، ایک نور۔ ساری ہدایت، ساری مثالیں اور ساری باتیں اور ساری (guidance) نور کی طرف جائے اور نور کو پانے میں تورات (complete) ہو جائے گا، نور کے قصّے میں، نور کے دلائل میں، نور کی باتوں میں، اشاروں میں، کنایوں میں اور ہر چیز میں، تو یہ ہے کہ تورات جو آسمانی کتاب تھی اپنے وقت میں موسیٰ علیہ السّلام پر نازل ہوئی تھی، اُس کے اندر ایک تو ہدایت تھی اور ایک نور کا تذکرہ تھا، نور کا بیان تھا تاکہ نور کی حقیقت کو سمجھنے کے بعد سارا کام خود نور ہی کرے، تو دیکھا کہ نور تک ہدایت جاتی ہے، (guidance) جاتی ہے۔ ساری مثالیں، تمام

اشارے، تمام وضاحتیں اِس معنیٰ میں ہیں کہ وہ نور کی طرف ہدایت ہے اور دُوسری بات اِس میں یہ ہے جو فرمایا گیا ہے کہ تورات کو ہر شخص نہیں سمجھتا تھا، تورات کو سمجھانے کی جو ذمہ داری تھی وہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں پر تھی۔ موسیٰ علیہ السّلام سے شروع کر کے اور جتنے انبیاء ہوئے اور جب تک موسیٰؑ کا (cycle) رہا، دَور، اُس دوران تو کتاب کا وارث کون ہوتا تھا؟ پیغمبر اور یہاں پر ایک پُرحکمت لفظ بھی آیا ہے۔ آپ بعد میں اِس کو (note) بھی کرنا (reference)، ''وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ''۔ یہ پیغمبروں کے بارے میں ہے اور اُن کے بعد جو ہیں اُن کے بارے میں ہے، شہدا ایک عربی لفظ ہے (plural) ہے شہید اور شاہد کا، گواہ اور اِس لفظ کے اندر (side) میں حاضر ہونے کے معنیٰ بھی ہیں۔ گواہ حاضر ہو تو گواہ بن سکتا ہے، کسی بھی واقعہ پر جب تک وہ حاضر نہیں ہے وہ گواہ نہیں کہلا سکتا ہے، گواہ نہیں بن سکتا ہے۔ اِس لئے اِس لفظِ شہید کے اندر دونوں معنیٰ ہیں، حاضر کے معنیٰ بھی ہیں اور گواہ کے معنیٰ بھی ہیں اور بہت پُرحکمت لفظ ہے، تو حضراتِ انبیاء اِس تورات پر گواہ بھی تھے اور حاضر بھی تھے۔

اب دیکھیں یہاں پر آپ کو بہت اچھی چیز ملے گی، بہت اچھی حکمت ملے گی۔ موسیٰ علیہ السّلام کے معاملے میں تو یہ بات ایک دم سے سمجھ میں آتی ہے کہ تورات جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی تو تورات کی رُوحانیت کو اور تورات کے نزول کو اور تورات کے نزول کے واقعات کو تو وہ (correctly) جانتے تھے۔ اب موسیٰؑ کے بعد جو دُوسرے اُن کے وارث پیغمبر ہوئے اُن پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی، وہ تو وہی کتاب چلاتے تھے، وہی شریعت عمل میں لاتے تھے جو موسیٰؑ کی تھی لیکن وہ کس (sense) میں اِس تورات کے گواہ ہوئے؟ بات (clear) ہے ایک مومن کے لئے کہ وہ بھی بحیثیت اِنبیاء اُس کی رُوحانیت کو دیکھتے تھے، کس طرح؟ موسیٰؑ پر تورات نازل ہوئی لیکن ہارونؑ نے اُس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، دل کی آنکھوں سے دیکھا کہ رُوحانیت میں گئے تو کہاں گئے؟ اُس مرکز پر گئے جہاں پر تورات نازل ہو رہی تھی۔ اُس کو بالکل اِسی طرح دیکھا جس طرح نازل ہوتی تھی، تو رُوحانیت جو ہوتی ہے اُس میں ''بُعد'' نہیں ہوتی ہے۔ میں نے ابھی ابھی کسی مقالے میں آپ کو بتایا کہ رُوحانیت میں (distance) نہیں ہوتا ہے، اگر کوئی مومن خوش بختی سے آنحضرتؐ کی رُوحانیت کو پائے تو وہ رُوحانیت جو ہے وہ (action) میں ہوگی یعنی وہ تازہ رُوحانیت ہوگی، اُس میں (distance) پیدا نہیں ہوتا ہے، اُس میں ''بُعد'' یعنی دُوری نہیں ہوتی ہے، تو لہٰذا ہارونؑ نے نزولِ تورات کو دیکھا اور دیکھا تو تبھی وہ گواہ ہوا اور دیکھا تب ہی تو وہ حاضر ہوا کیونکہ میں نے آپ سے کہا نا کہ شہید یا کہ شاہد جو لفظ ہے وہ عربی میں گواہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور حاضر کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے، تو ہارون علیہ السّلام نے دیدۂ دل سے، دیدۂ باطن سے، (inner side) سے مشاہدہ کیا کہ کس طرح یعنی تورات شروع سے لے کر کس طرح آخر تک نازل ہوتی تھی، (miracles) میں، (spiritual miracles) میں مشاہدہ کیا۔ اب چونکہ یعنی دو پیغمبروں کا اِس میں ذکر نہیں ہے، ''النَّبِيُّوْنَ'' عربی میں

جو دو سے اُو پر صیغہ یعنی (word) جو (noun) جو دو سے اُو پر کو جاتا ہے تو وہ عربی میں (plural) بنتا ہے۔ ایک میں (singular) ہوتا ہے، دو ہے تو تسمیہ ہوتا ہے، (dual) کہتے ہیں اور دو سے جو اُو پر جاتا ہے تو (plural) بنتا ہے، تو یہ (plural) ہے، تو دو سے زیادہ کے لئے استعمال ہوا ہے، دو سے زیادہ جتنے بھی ہوں تو وہ عربی میں جمع ہوتے ہیں، تو بہت سارے پیغمبروں نے یعنی موسیٰ علیہ السّلام کے بعد اِس نزول کے واقعات کو یعنی کس طرح تورات موسیٰ علیہ السّلام پر نازل ہو رہی تھی اور کوہِ طور پہ جب گئے تھے تو کیا ہو رہا تھا اِنہوں نے دیکھا۔

اِس معنی میں خدا نے اِن کو کہا کہ کیونکہ وہ حاضر تھے گواہ تھے۔ دُنیا کے معاملات میں کسی آدمی نے کوئی آدھا واقعہ دیکھا ہو تو بہ ضرورت اُس کو گواہ میں لے لیا جائے گا اور قسم دِلا کر بھی کسی کو گواہ میں لے لیا جائے گا لیکن خدا کے قانون میں، خدا کی خدائی میں کسی بھی رُوحانی معاملے میں کسی کو گواہ نہیں لیا جاتا ہے جب تک، کہ کسی نے (fully) اُس واقعہ کو نہیں دیکھا ہے، تو کتنی اچھی بات ہے، کہ ہم اِس مثال سے قرآن کی رُوحانیت کو اور امامؑ کی رُوحانیت کو اور اپنے پیروں کی رُوحانیت کو اور دیگر مومنین کی رُوحانیت کو ہم اِسی مثال سے با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ خدا کی عادت ایسی ہے کہ بات جو ہے مغرب میں کرتا ہے اور اُس کا مقصد ہوتا ہے کہ مشرق میں بھی یہی چیز ہے اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ مشرق والے کیا خیال کرتے ہیں۔ کیا وہ مشرق والے اِس بات کو صرف مغرب ہی سے متعلّق جانتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا قانون ایک ہے، اُس کی سنّت ایک ہے، اُس کی عادت ایک ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بات موسیٰؑ کے بارے میں کہی گئی ہے تو آنحضرتؐ کے بارے میں بھی وہی بات ہے، اگر کوئی بات تورات کے بارے میں ہے، تو قرآن کے بارے میں بھی وہی بات آتی ہے۔ لہٰذا یہ جو فرمایا گیا کہ تورات نازل ہوئی تھی اُس میں سب سے جو اُونچا مضمون تھا، جو موضوع تھا وہ ہدایت اور نور کا موضوع تھا لیکن اِس کے باوجود وہ سمجھاتے کون تھے؟ انبیاء سمجھاتے تھے کیوں؟ کہ وہ رُوحانیت میں اُس تورات کو بنیاد سے سمجھتے تھے، اُس کے رُوحانی واقعات کو، اُس کے باطنی واقعات کو وہ جانتے تھے۔ لہٰذا یہ اُن کے ذمّہ تھا کہ مُریدوں کو، اُمّت کو اور اُن لوگوں کو جو اسلام میں لے آئے تھے، جو دیندار تھے اُن کو تورات کی وضاحت کریں، تو بہت اہم بات ہے، میں آپ کو اِس کا (reference) بتاتا ہوں کہ یہ سورۂ مائدہ ہے جو پانچ نمبر کا سورہ ہے اور آیت ہے چوالیس (۴۴) نمبر کا، یہ آپ کو ''امام شناسی'' میں بھی کہیں یہ آیت ملے گی لیکن اتنی وضاحت اُس میں نہیں ہے۔ اِس وضاحت کو اُس وضاحت کو ملانا اور پھر آپ اپنے مضمون کو (powerful) بنانا [امام شناسی، صفحہ نمبر ۶۷]، تو آپ نا بھولئے گا اِس مثال کو کہ خداوندِ عالم نے ارشاد فرمایا کہ تورات جو اصل تورات تھی، وہ تورات نہیں جس میں ہیر پھیر کیا گیا، کیونکہ تورات اور انجیل کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک اصل ہے (original) ہے اور ایک وہ ہے جس میں لوگوں نے دست اندازی کی ہے، اُس میں قلم چلایا ہے، اپنے ہاتھ سے لکھا ہے یا ترجمے میں تبدیلیاں کی ہیں۔ آپ اِس لفظ کو تو لیجئے نا کہ (modern)، (old) اِس کے کیا معنی ہیں؟ ہم قرآن کے

بارے میں تو ایسا نہیں کہتے،(new quran)،(old quran)۔ یہ اُس وقت ممکن ہے جب کہ کوئی شخص دُنیا میں ایسا ہو جو قرآن کے اندر ترمیمات کرے تو پھر جو ترمیم شدہ چیز ہوگی وہ (modern) ہوگی یا (new) ہوگی اور جو ترمیم کے بغیر (original) ہوگی تو وہ (old) ہوگی۔ اِن کے (concept) کو دیکھیں نا کہ اِنہوں نے اِس کو (old) بنایا اور (modern) بنایا، اِس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر وقت اِس میں تبدیلیاں کرتے آئے ہیں۔ اِس لئے یہ یہاں پر یہ بات بھی بتانی ہے کہ یہاں جس تورات کا ذکر ہو رہا ہے وہ (original) ہے۔ لیکن (original) ہونے کے باوجود لوگ اُس کو نہیں سمجھتے تھے، یہ لوگوں کا ذمّہ نہیں تھا کہ خود اپنے لئے اُس میں سے ہدایت تلاش کریں اور کتنی صاف بات ہے ہمارے (discussion) کے لئے، تو تورات میں نور تھا، ہدایت بھی تھی لیکن عوام یہ نہیں سمجھتے تھے۔ کوئی پیغمبر اُن کو یہ سمجھاتا تھا کہ نور کس طرح سے ہے اور ہدایت کس طرح نور کی طرف جاتی ہے، اِس سے ظاہر ہے یہی اُصول اور یہی قانون قرآن کے لئے ہے۔ آج اسمٰعیلی یہ کہتے ہیں کہ قرآن کا جاننے والا ایک آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں اور آپ کے بعد آپ کے جانشین، آپ کے وصی۔ ابھی آیت آئے گی بالکل اِس طرح سے کہ قرآن بھی ایسا ہے کہ اُس میں دو باتیں ہیں، ایک ہدایت اور ایک نور ہے۔ اِس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر مان لیا جائے تو ہر آیت، ہر آیت نور کی ہدایت رکھتی ہے اور اُس میں بس سب سے اُونچی چیزیں دو ہیں۔ ایک تو ہے نور کی طرف ہدایت اور ایک ہے نور اور ویسے تو جس طرح تورات کا حال ہے، اِس طرح قرآن کے اندر بھی بہت سارے مضامین ہیں۔ اُس میں وہ کون سی چیز ہے جس کا ذکر نہیں ہے؟ ہر چیز کا ذکر ہے، ہر چیز کا بیان ہے، ہر قسم کی باتیں ہیں جو مفید ہیں، جو علم کی ہیں لیکن اعلیٰ جو مقصد ہے اُس کے اندر ہدایت اور نور [ہے]، تو نہ بھولئے گا تورات کی اِس مثال کو۔

اُس کے بعد خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ: ''وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَاٰتَيْنَاهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ'' (۵:۴۶) اور اُن پیغمبروں کے بعد ہم نے عیسیٰؑ کو بھیجا بحیثیتِ پیغمبر کے عیسیٰ ابنِ مریم کو بھیجا، وہ اپنے سے اگلے پیغمبروں کی تصدیق کرنے والا تھا اور تورات کی بھی وہ تصدیق کرتا تھا، (confirm) کرتا تھا اور ہم نے اُس کو تورات دی۔ ''فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ'' بالکل اُس میں بھی جو مقصدِ اعلیٰ تھا وہ یہی تھا کہ ہدایت تھی اور نور۔ جس طرح تورات کے بارے میں فرمایا گیا بالکل اُسی طرح انجیل کے بارے میں ارشاد ہوا کہ انجیل میں ایک تو ہدایت تھی اور دوسرا نور یعنی نور کا ذکر تھا، کہ نور جو مقصدِ اعلیٰ تھا یا سب سے بڑا جو موضوع تھا وہ یہ تھا، کہ لوگوں کو نور کا راستہ بتا دیا جائے اور اگر لوگوں نے نور کا راستہ پالیا اور نور تک رَسا ہو گئے تو اب کیا ہوگا؟ کیا پھر وہ کتاب سے رُجوع کریں گے یا نور سے ہدایت حاصل کریں گے اب؟ تو یعنی پہلے مرحلے میں جو ہدایت ہے وہ نور تک ہے۔ نور کی شناخت ہوگئی، نور کے لئے اقرار کیا گیا تو ایک حد تک کتاب کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب (next) میں مقصد ہے وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ کتاب کی ذمّہ

داری ایک طرح سے ختم ہوگئی، کتاب کا ایک طرح سے جو اصل مقصد ہے وہ پورا ہوگیا، کیا تھا؟ لوگوں کو نور تک یعنی امامؑ تک پہنچا دینا لیکن یہ کس صورت میں ممکن تھا پیغمبر یا اُس کا کوئی جانشین کتاب پڑھے، لوگوں کو سکھائیں اور لوگ باور کریں تو تب نور تک رسائی ہو، نہیں تو اگر لوگ خود از خود اُس کتاب کو پڑھتے ہیں تو نور اُن کو نہیں مل سکتا ہے، یہ (condition) نہیں ہے جس طرح اگلی آیت میں ہم نے پڑھا، تو چنانچہ عیسیٰ علیہ السّلام پر تورات نازل ہوئی، اُس میں نور کی طرف ہدایت تھی اور نور کا ذکر تھا۔ اب ہمارا یہ سوال بھی ختم ہوگیا نا کہ اگر کتاب کے اندر جس نور کا ذکر ہے وہ نور چمکتا ہوا ہوتا، دمکتا ہوا ہوتا، تو پھر کسی پیغمبر کے سمجھانے کی ضرورت بھی کیا تھی اور پھر ہدایت کے ہونے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا سورج دُنیا میں چمکتا ہے، تو کیا اُس کی روشنی اور چمک ہدایت نہیں ہے، (guidance) نہیں ہے؟ کسی کو کہنا چاہئے کہ دیکھو سورج آفتاب اُدھر ہے۔ اگر اِسی طرح قرآن کے اندر نور ہوتا چمکتا دمکتا عملی صورت میں، تو اُس کی چمک اور دمک خود ہدایت ہوتی، اُس صورت میں کسی لفظی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ کسی پیغمبر کے سمجھانے کی ضرورت ہوتی۔ بات واضح ہوگئی کہ اِس طرح سے وہ نور نہیں ہے، وہ حکمت کی زبان میں ہے، وہ مثالوں میں ہے، وہ تاویل میں ہے، وہ کوئی پیغمبر سمجھائے تو نور، قرآن کے اندر جو نور ہے مل سکتا ہے۔ نہیں تو قرآن کے اندر نور ہے بیشک لیکن نظر نہیں آتا ہے لیکن جو نور عملاً ہے، جو قرآن سے الگ ہے وہ تو امامؑ ہے اور امام بھی ایسا نہیں ہے۔ اب نہیں موسیٰؑ کے زمانے میں، عیسیٰؑ کے زمانے میں، اگلے زمانے میں اگر امامؑ ایسا ہوتا کہ جہاں بھی جائے تو اُس سے شعلے برسیں، روشنی پیدا ہو جس طرح سورج سے روشنی نمایاں ہے، اُس میں حرارت بھی ہے، تو سب لوگ مانتے ہیں سورج ہے اور جو حیوان ہے وہ بھی ایک طرح سے سمجھتا ہے، جو پرندہ ہے اُس کو بھی ایک طرح سے معلوم ہے، تو پھر سب لوگ اُس نور کو سمجھتے، پھر کتاب ساری فضول ہو جاتی۔ کتاب کی بھی کیا ضرورت ہے کہ اُدھر جو نور ہے، جو امامؑ ہے، جو پیغمبر ہے وہ چمکتا ہے، اُس سے (rays) نکلتی ہیں اور شعلے نکلتے ہیں، معجزات کرتے ہیں اور جہاں بھی جاتے ہیں تو درخت جھکتے ہیں، دیواریں بولتی ہیں، زمین پھٹ جاتی ہے، سایہ نہیں پڑتا ہے، مکھی نہیں بیٹھتی ہے، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بس نور دَرخشان اور تابان اور ضوفشان ہو جاتا ہے۔ پھر کسی کتاب کے اِس بات پر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی کہ دیکھو تم نور کی شناخت حاصل کرو۔ جس طرح میں نے سورج سے مثال دی کہ اُس سورج کے بتانے کے لئے دُنیا میں (guidance) نہیں ہے۔

''آفتاب آمددلیلِ آفتاب''، سورج اپنے آپ کا (guide) ہے اور سورج کی روشنی (guidance) ہے۔ جو بھی آنکھ رکھتا ہے وہ سورج کو اِس روشنی میں دیکھتا ہے لیکن امامؑ دُنیا میں اِس طرح سے نہیں ہے۔ اُس کو دیکھنے کے لئے کوئی اور آنکھ چاہئے، اِس آنکھ کے سامنے وہ نور نمایاں نہیں ہے، اِس آنکھ کے سامنے نہ تو قرآن میں کوئی نور نظر آتا ہے اور نہ جہاں پر پیغمبر ہے، انسانِ کامل ہے، امامؑ ہے اُس میں کچھ روشنی نظر آتی ہے اور روشنی کی بجائے کچھ اُن کو تاریکی نظر آتی

ہے اور تاریکی اِس لئے نظر آتی ہے کہ اُن کی جو آنکھ ہے وہ تاریک ہے۔کوئی شخص دن کے وقت یا رات کے وقت کالی کالی عینک لگاتا ہے تو دُنیا اُس کے لئے کالی کالی ہو جاتی ہے، ہر چیز یہاں تک کہ سورج بھی کالا کالا نظر آتا ہے، تو جو لوگ پیغمبر کو اور امام کو ایک عام بشر سمجھتے ہیں تو یہ اُن کی آنکھ کا نقص ہے، اُن میں وہ بصیریت نہیں ہے جو دل میں ہوتی ہے، اُن میں دیدۂ باطن نہیں ہے، اُن میں دل کی آنکھ نہیں ہے۔

اچھا تو ہم (next)، (second) مرحلے میں آئے ہیں، تورات کے بعد انجیل کی بات کرتے ہیں کہ انجیل میں بھی وہی بات ہوتی ہے کہ خداوندِ عالم نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر انجیل نازل کی اور اُس انجیل کے اندر ہدایت تھی اور نور تھا، ''مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ'' (۴۶:۵) اِس انجیل سے آگے جو آسمانی کتاب تھی اس کی یہ تصدیق کرتی تھی ''وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ'' (۴۶:۵) اور اُس میں ہدایت تھی اور نصیحت تھی پرہزگاروں کے لئے، گناہ گاروں کے لئے نہیں پھر یہ فرق بھی ہے، اِس کے بعد فرمایا جاتا ہے: ''وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ'' (۴۸:۵) اے رسول! اِسی طرح ہم نے آپ پر کتاب نازل کی یعنی قرآن، حق کے ساتھ یہ قرآن تصدیق کرنے والا ہے اپنے سے قبل کی کتابوں کی یعنی تورات، انجیل اور دیگر آسمانی کُتب کی تصدیق کرتا ہے قرآن ''وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ'' (۴۸:۵)، اور اُن پر نگہبان ہے اور اُن سب پر شامل ہے یعنی اِس کے اندر تورات بھی ہے، انجیل بھی ہے۔

جس طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں سب انبیاء جمع تھے، (include) تھے کیونکہ آپ خاتم الانبیاء تھے، چونکہ آپ سردارِ رُسول تھے اِس لئے سب پیغمبر آپ میں جمع تھے۔ بالکل اِسی طرح سے اِس قرآن کے اندر سابقہ آسمانی کتابیں جمع ہیں۔ جب مان لیا گیا کہ سابقہ آسمانی کتابیں اِس کے اندر جمع ہیں تو اُن کے اُصولات، ہدایات بھی اِسی طرح سے ہیں، یعنی اِس میں بھی وہی بات ہے، کیا بات ہے؟ اِس کا جو (main subject) ہے وہ (guidance and light) ہے، ہدایت اور نور اور اِس کے بارے میں بھی یہی ہے کہ آنحضرتؐ خود اپنی پاک زندگی میں خود ہی سمجھاتے تھے لوگوں کو اور آپ کے بعد آپ کے جانشین کا یہ فرض تھا کہ لوگوں کو سمجھائیں اور کوئی شخص از خود قرآن کو نہیں سمجھ سکتا ہے اور اِس کے اندر جو نور ہے وہ کوئی نہیں دیکھ سکتا ہے سوائے کہ پیغمبر کسی کو سکھائیں اور امام کسی کو بتائیں وہ رستہ بتائیں، طریقہ بتائیں، وہ بصیرت دیں، وہ آنکھ دیں تو اِس کے اندر نور ہے اور جس کی آنکھ نہیں ہے اُس کے لئے نور نہیں ہے۔ اب میں اِس سلسلے میں گو کہ دانشمند کے لئے یہ آیت بھی وہی ہے کیونکہ ''مُهَيْمِنًا'' (۴۸:۵) کہا کہ اِس میں وہ (include) ہیں وہ تمام آسمانی کتابیں، تو اِن سابقہ آسمانی کتابوں کے جو اُصولات ہیں اور جو (subject) جس طرح اُن میں تھا اِس میں ایسا ہی ہے۔ جب وہ کتابیں اِس کے اندر شامل ہیں تو اِس کے باوجود وہ (clear) آیت میں آپ کو بتاؤں گا جس میں یہ بات ہے کہ قرآن کا (subject) ہدایت ہے اور نور: ''يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ''

(۳۵:۲۴) خدا نور کا راستہ بتاتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ دیکھا آپ نے کہ نور خود نہیں بلاتا ہے، اِس چشمِ ظاہر میں نور کی جو روشنی ہے وہ ظاہر نہیں ہے۔ اِس کے لئے ہدایت کی ضرورت ہے۔: ''یَھۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ'' اس میں نور تک جانے کے لئے (condition) یعنی شرط جو ہے وہ ہدایت ہے اور ہدایت کے لئے شرط جو ہے یعنی اللہ کی مرضی ہے۔: ''یَھۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ'' خدا ہر کسی کو ہدایت نہیں دیتا ہے، خدا ہر کسی کو اپنا نور نہیں بتاتا ہے، نہیں دکھاتا ہے ''مَنۡ یَّشَآءُ'' جس کو چاہے اُس کو وہ نور بتاتا ہے اور چاہنے کی بھی (condition) ہے۔ نور تک جانے کی (condition) ہدایت ہے، ہدایت کی (condition) اللہ کا اِرادہ ہے یا اللہ کی خواہش ہے، اللہ کی رضا ہے اور اللہ کی رضا کے لئے بھی (condition) ہے، کیا ہے؟ یعنی مومن اِس قابل ہو کہ اللہ چاہے یا اللہ کے چاہنے کے قابل ہو جائے، تو اللہ کا چاہنا جو ہے وہ کچھ انسانوں کے چاہنے کی طرح نہیں ہے۔ انسان خوامخواہ بھی چاہتا ہے، بلالحاظ بھی چاہتا ہے، لحاظ سے بھی چاہتا ہے، انصاف سے بھی چاہتا ہے اور بغیر انصاف سے بھی کسی کو کچھ دینا چاہتا ہے۔ انسان کے ارادے کے لئے کچھ قانون نہیں ہے، یہ اُس کی مرضی ہے۔ کبھی وہ نفس کی طرف جھکتا ہے، کبھی وہ عقل کی طرف جھکتا ہے کبھی درمیان میں معلّق رہتا ہے، کبھی دوسرے سے متاثر ہوتا ہے، تو انسان اِس طرح چاہتا ہے لیکن اللہ کا جو چاہنا جو ہے وہ قانون کے مطابق ہے، اُس کا چاہنا (set) ہے قانونِ قدرت کے مطابق، تو لہٰذا خدا جس کو چاہے سے مُراد یہ کہ جو انسان خدا کے قانون کے مطابق عمل کرے، تابعداری کرے تو خدا اُس کو چاہے گا تو: ''یَھۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ'' نور سے آگے ایک ہدایت شرط ہو گئی۔ اب نور کے بعد جو نورانی ہدایت ہے وہ اِس سے الگ ہو گئی، تو اللہ جس جو چاہے نور کا رستہ بتاتا ہے تو کس طرح بتاتا ہے؟ پیغمبر سے؟ حدیث سے؟ قرآن سے؟ یعنی کوئی شخص قرآن پڑھ کر نور کو نہیں پا سکتا ہے، حدیث کی روشنی میں کوئی شخص نور کو نہیں پا سکتا ہے۔ یہ اللہ کی مرضی ہے کہ کسی کو قرآن کے ذریعے سے، توفیق کے ذریعے سے یا کسی بھی وسیلے سے امامؑ کا رستہ بتائے، تو پھر تینوں آسمانی کتابوں کیا ایک ہی (set) اُصول ہو گیا، پہلے کتابی ہدایت جو امامؑ تک جاتی ہے، پھر نور اور ابھی میں نے کہا تھا کہ قرآن کا ایک حد تک مقصد اُس وقت پورا ہوتا ہے جب کہ کسی کو امامؑ ملے۔ قرآن کے وسیلے سے کسی کو امامؑ ملتا ہے تو قرآن کا مقصد اُس کے لئے مکمل ہے، اور کوئی مقصد اِس کا نہیں ہے۔ دیکھا اِس آیت کے مطابق؟ یہی ہے نا اِس کا مقصد؟ قرآن کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ کسی کو امامؑ دکھائے مگر خود نہیں، پیغمبر کے ذریعے سے، خود امامؑ کے ذریعے سے، پیر کے ذریعے سے یا امامؑ نے جو وسائل پیدا کیے ہیں، پیغمبر نے جو وسائل بتائے ہیں اُن کے ذریعے سے اگر کسی کو قرآن کی روشنی میں امامؑ ملتا ہے تو قرآن کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ اب (second) میں کیا ہے اِس کا؟ اب یہ امامؑ کے تحت جائے گا، امامؑ کی معرفت کے بعد اِس کے اندر عجائبات، علمی (miracles) وغیرہ اور پھر سب میں وہی کام پھر اِس میں زیادہ سے زیادہ امامؑ کی معرفت، زیادہ سے زیادہ امامؑ کی شناخت، زیادہ سے زیادہ امامؑ کی تعریف، یہ چیزیں

ہونے لگیں گی اور کوئی نئی چیز اِس میں سے نہیں ہوگی۔

اب میں چاہتا ہوں کہ اِسی موضوع پر کچھ سوالات ہوں، اگر آپ نے یہ سمجھ لیا تو مجھے بے حد خوشی ہوگی کیونکہ یہ جو مضمون ہے یہ ایسا مضمون ہے کہ دوبارہ اِس کو (repeat) کرنا چاہیئے۔ مجھے آپ سے سوالات کر کر کے پوچھنا چاہیئے، مجھے یہ یقین حاصل کرنا چاہیئے کہ آپ نے اِس مضمون کو سمجھ لیا ہے۔ یہ سورۂ مائدہ میں ہے اور ہم نے ''امام شاسی'' کے اُس (chapter) میں اِس کو بیان کیا ہے جو نور سے متعلق ہے، کون سا حصّہ ہے؟ حصّہ دُوم میں ہے [امام شاسی، صفحہ ۶۷۔۶۹] میرے نزدیک اسماعیلیوں کے لئے جو قرآن پڑھنا چاہتے ہیں سب سے اوّل، سب سے پہلے اِس مضمون کو اِس طرح سے لینا چاہیئے، نہیں تو اُلجھن ہو سکتی ہے اور یہ بات اتنی مضبوط ہے کہ اِس سے بڑھ کر اور کیا مضبوطی ہو کہ تینوں آسمانی کتابیں یک زبان ہو کر یعنی امامؑ کی تعریف کرتی ہیں، کہتی ہیں کہ ہم اگر ہیں تو اِس لئے ہیں کہ امام کو دکھائیں، ہمارا مقصد اور کچھ نہیں ہے، امام کو بتانا ہے، امامؑ کی طرف (reference) دینا ہے، امامؑ کی طرف اشارہ کرنا ہے، امامؑ کی طرف (hint) کرنا ہے۔ ہم ایک رستہ بنیں اور جس سے کوئی چل کے امام تک پہنچے، ہم ایک رستہ بنیں جس سے چل کر کوئی امامؑ تک پہنچے، تو یہ رستہ ہے، سبیل ہے، (guidance) اور راستے میں کیا فرق ہے؟ رستہ ہے، اگر کوئی صحیح چلتا ہے تورات میں، انجیل میں، قرآن میں، کسی بھی آسمانی کتاب میں، کائناتی کتاب میں اور کتابِ نفس میں جو انسان کی اپنی ذات ہے اِس کی (study) میں اگر کوئی صحیح جاتا ہے تو اُس کو امامؑ تک پہنچنا چاہیئے کیونکہ یہ جو ہدایتیں ہیں اور اب دُنیا کے اندر اگر ہدایتیں ہیں تو یہ کس مقصد کے لئے ہیں؟ تو یہ امامؑ کے در کی ہدایتیں ہیں، تو ہر چیز امامؑ کی طرف اشارہ کرتی ہے، دُنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، قرآن اور تورات، انجیل کے بعد کہ اُس میں امامؑ کی طرف ہدایت نہیں ہو آسمان، زمین، صفحۂ کائنات، کتابِ نفس، تو یہ بات بہت بڑی ہے، یہ مضمون بہت ہی عظیم ہے۔ اب میں رُک کے اِس سلسلے میں انتظار کروں گا کہ اگر اِس سلسلے میں کوئی سوال ہو تو وہ کیا جائے اور اگر سوال نہیں تو بڑی خوشی کی بات ہے اور شاید اب یا بعد میں ہم مل کر (discuss) کریں گے، جب تک (discuss) نہیں کریں گے تو یہ بات پختہ نہیں ہوگی۔ ہمیں یعنی آزادی سے اِس میں مذاکرہ کرنا ہے اور یہ بات بالکل ایک اپنے لئے ایک علمی سرمایہ بنانا ہے، اِس کو (capital) بنانا ہے اور ہر وقت اِس کو یاد رکھنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اِس کے بعد کوئی ذیلی بات آوے اور ہمارے لئے رُکاوٹ اِس سے پیدا ہو۔ وہ کوئی ذیلی بات ہوگی اور پختہ بات یہ ہے کہ ہم نے (realize) کیا کہ تورات کا (subject) کیا تھا اور انجیل کا (subject) کیا تھا اور قرآن کا جو (main subject) ہے وہ کیا ہے، تو یہ ہے کہ وہ ہدایت ہے امامؑ کی طرف رستہ بتاتے کے لئے، اب میں ذرا رُکتا ہوں، شکریہ۔

اِنہوں نے لفظِ حاضر کو لیا اور حاضر کے معنی میں بتایا اور حاضر کے معنی کو شاہد کے معنی کے ساتھ ملایا اور تاویل کے

لحاظ سے یہ صحیح ہے۔ تاہم اِس کا ایک دُوسرا پہلو ہے کہ ہم اِس لفظِ حاضر کو زیادہ سے زیادہ (opposite to) غائب یعنی ہمارا امامؑ غائب نہیں ہے، حاضر ہے اِس (sense) میں بھی یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور آپ کا کہنا بھی صحیح ہے امامؑ کے متعلق جو بھی تاویل کریں وہ صحیح ہے۔ امامؑ کے متعلق جو بھی اچھی تاویل کریں وہ خود بخود صحیح ہوتی ہے کیونکہ حق وصداقت کے مالک امامؑ ہیں اور جنابِ رسالت مآب نے ارشاد فرمایا کہ: ''اَللّٰھُمَّ اَدِرِ الحَقَّ مَعَہٗ حِیثُ دَارَ'' یا اللہ! سچائی کو وہاں گھما دے جہاں علیؑ گھومے یعنی علیؑ جس طرف کو جائیں سچائی بھی اُن کے پیچھے پیچھے جائے، تو یہ بات میں کبھی کی تھی کہ دُنیا کے لوگ جو ہیں سچائی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں لیکن ایک ذات ایسی ہے دُنیا کے اندر کہ جس کے پیچھے سچائی اور صداقت چلتی رہتی ہے، تو امامؑ جس (side) میں ہوں سچائی اُس (side) میں ہوتی ہے اور دُنیا والے یعنی کہتے ہیں کہ یہ ہے اور یہ نہیں ہونا چاہئے تو اُن کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کس معیار سے کسی چیز کو پرکھنا چاہتے ہیں اور معیار کہاں ہے؟ معیار تو امامؑ ہے۔ اِس حدیث کے مطابق، معیار اور کسوٹی امام قرار پائے۔ پیغمبر نے فرمایا کہ خداوندِ علی (means) امام جہاں جائے حق کو اُس کے پیچھے لگا دے، تو یہ بات ہے کہ رسولؐ جو دُعا کرتے تھے خدا کے اشارے سے کرتے تھے اور جو بات حقیقت ہوتی تھی وہی دُعا کرتے تھے، تو اگر حق کو ایک ہی (line) پر ٹھہرنا ہوتا اور اُس کو اِدھر اُدھر نہیں ہونا ہوتا اور اُس کے لئے گردش پانے کی ضرورت نہیں ہوتی گنجائش نہیں ہوتی تو یہ دُعا نہ ہوتی۔

زمانۂ رسول سے قبل یہود و نصاریٰ اپنے اپنے وقت میں کامل مذہب رکھتے تھے، اُن کی شریعت تھی، اُن کا قبلہ تھا، اُن کی آسمانی کتاب تھی، وہ پیغمبروں پر ایمان لاتے تھے لیکن یہ چیز کب تک قائم رہتی ہے؟ دوسرے ہادی کے آنے تک، دُوسرا ہادی آگیا تو سب معیار اور سب میزان جو ہیں ختم ہو گئے، تو رسول اللہؐ کے آنے کے ساتھ ساتھ یہ سوال نہیں رہا کہ کوئی کتاب یا قبلہ ہے، شریعت ہے۔ کسی بھی پیغمبر نے یہ نہیں کہا تھا کہ دیکھو میرا دین قیامت تک قائم رہے گا اور کوئی نہیں آئے گا، ایسا نہیں ہے۔ قرآن میں تو یہ ہے کہ پیغمبروں نے ایک دوسرے پر ایمان لایا، ہر نبی نے آنے والے پیغمبر پر ایمان لایا۔ اِس (sense) میں نہیں کہ اُس کا ایمان نہیں تھا لیکن (confirmation) کیا اور تصدیق کی۔ اِس معنیٰ میں ایمان لانے کے دو معنی ہیں، ایک کافر سے مسلمان ہونا اور لادین سے دیندار ہونا اور دُوسرا یہ کہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ آنے والے پیغمبر کی تصدیق کرنا۔ تو وہ آیت قرآن میں موجود ہے کہ ہر نبی نے آنے والے پیغمبر کی تصدیق کی اپنے بعد وہ سامنے بالمشافہ بات تھی یا آنے کی اُن کو خبر تھی، تو قرآن میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے آنحضرت صلّی علیہ وآلہٖ وسلّم کے آنے کی بشارت دی تو پھر وہ لوگ کیوں منکر ہو گئے؟ تو دیکھا کہ یعنی حق اور صداقت کو عیسیٰؑ نے آنحضورؐ کے سامنے پیش کیا یہ فرماتے ہوئے کہ میرے بعد ایک نبی آنے والا ہے، اِسی کے ساتھ بات ختم ہو گئی، پھر لوگ نہیں سمجھتے، یہ بھی ایک اچھی مثال ہے نا کہ بالکل حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا تھا، آنحضرت کے آنے کے بارے میں پیشگوئی کی تھی،

بشارت دی تھی، خوشخبری دی تھی اور اِسی طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنے جانشین کو نامزد کیا تھا زندگی ہی میں، تو حق اور صداقت آپ کے جانشین میں ہے، دوسروں کو پرکھنے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ رسولؐ نے اُن لوگوں کو بتایا جو حضورؐ کے سامنے تھے اور بعد کے وقت کے لئے آنحضرتؐ نے اپنے جانشین کو مقرر فرمایا۔ اب یہ جاننا ہوتا ہے نا کہ اِس آیت سے یہ پتہ چلا کہ نور کے ذمّہ میں کوئی بات نہیں ہے، یہ بات یا تو پیغمبر کے ذمّہ ہے یا خدا کے ذمّہ ہے، نور کے ذمّہ میں جو لوگ اُس تک پہنچیں گے اُن کی ہدایت، اُن کی پرورش، اُن کو علم دینا یہ نور کا ذمّہ ہے، نہیں تو پیغمبرؐ کا ذمّہ ہے تو اُس نے اپنی ذمّہ داری پوری کی لوگوں کو بتایا۔

ٹرانسکرائب: نورالدّین ٹائپ: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: خدا کی معرفت، خیر وشر کا مضمون

کیسٹ نمبر: ۷۰ تاریخ: اکتوبر ۱۹۸۲ء کراچی

Click here for Audio

آپ عزیزان کے سامنے بہت ساری مفید باتیں پیش کیں اپنے تجربات سے، اپنی معلومات کے خزانوں سے، اور خاص کر مولانا حاضر امامؑ کے مقدّس ارشادات سے۔ بہت ساری چیزیں، تو بیشک غور کرنے کی بات ہے کہ صفحۂ کائنات یا کہ کتابِ کائنات اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی کتاب ہے جو (open) ہے، جو کُھلی ہے اور اُس میں آیات ہیں، آیات کے معنی نشانیاں اور آیات کے معنی معجزات، تو معجزات اور نشانات کا مطلب ایک ہے۔ کس چیز کا نشان؟ نشان کسی ہستی کا ثبوت ہوتا ہے۔ نقشِ پا کسی کے چلنے کی خبر دیتا ہے اور کہیں سے دُھواں نکلتا ہو تو پتہ چلتا ہے کہ وہاں پر آگ ہے یا کوئی گھر ہے، اور ہر جانور اور ہر انسان کی آواز ایک نشان ہے اُس جانور کے یا اُس انسان کے موجود ہونے کا، تو خدا کی آیات خدا کی ہستی کا ثبوت ہیں اور آیات کیلئے تین مقامات ہیں۔ [۱] کتابِ الٰہی ہے یعنی آسمانی کتاب [۲] کتابِ کائنات ہے اور [۳] کتابِ نفس ہے۔

اِن تین چیزوں میں سے نزدیک ترین جو شئی ہے یا نزدیک ترین جو اسکول یا مکتب ہے وہ اپنی ہستی ہے گو کہ یہ تین چیزیں ایک ہیں اور اِن تینوں کتابوں میں ایک ہی قانونِ فطرت ہے، ایک ہی قانونِ الٰہی ہے۔ تاہم جو چیز نزدیک ترین ہے وہ نزدیک ہونے کی حیثیّت سے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے یعنی کتابِ نفس، انسان کی ذات کی کتاب یا کہ انسان کی رُوح کی کتاب یا انسان کی اپنی انا کی کتاب، اور یہی سبب ہے کہ فرمایا گیا: ''مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَهُ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّه'' جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تو اُس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔ دیکھا آپ نے؟ حالانکہ کتابیں ہیں تین، ایک تو کتابِ کائنات، ایک تو قرآن اور ایک انسان کی اپنی ذات کی کتاب، لیکن جب معرفت کا ذکر آیا تو اُس میں کتابِ نفس کا حوالہ دیا گیا۔ قرآن کو اور کتابِ کائنات کو چھوڑ کر انسان کی ذات کی طرف اشارہ کیا گیا، وجہ اِس کی کیا تھی؟ بس یہی کہ یہ نزدیک ترین شئی ہے، کہ قرآن عربی زبان میں ہے، کائنات بہت دُور ہے کہ اُسکا تجزیہ جس طرح سے ہونا چاہیے نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے سب سے پہلے انسان کو چاہیئے کہ اپنے باطن میں جائے، کتابِ نفس کو پڑھے، اور یہاں جو فرمایا گیا: ''مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَهُ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّه'' اِس اِرشاد میں جتنے الفاظ ہیں وہ سب قابلِ غور ہیں اور قابلِ توجہ ہیں۔ یہاں نفس سے

خودی بھی مراد ہے، اسکا مطلب انا بھی ہے، اسکے معنی رُوح بھی ہے کیونکہ نفس اور رُوح کا مطلب ایک ہے، تو چاہے کوئی اسکے معنی ذات بتائے یا انا یا خودی یا رُوح یا نفس لیکن مطلب ایک ہی ہے، اور دوسری بات یہاں خدا کے ناموں میں سے ربّ جو آیا ہے اسکے آنے میں حکمت ہے اور وہ یہ حکمت ہے کہ ربّ کا مطلب پروردگار ہے، پالنہار ہے، تو معرفت کے سلسلے میں ربّ کا ذکر اسلئے ہوا کہ ربّ پالنے والے کو کہتے ہیں اور پالنا تین طرح سے ہے۔ [۱] ایک تو سب سے اعلیٰ عقل کی پرورش ہے یعنی عقل کو پالنا ہے اور اُسکے بعد [۲] رُوح کو پالنا ہے، اور [۳] پھر ادنیٰ درجے میں جسم کی پرورش ہے، تو خدا کی جتنی صفات ہیں، یعنی خدا کے سَو نام، تو وہ سَو نام یا کہ وہ سَو صفات انسان کی اِن تین قسم کی پرورشوں میں لگی ہوئی ہیں خدا کی صفات، کوئی اسم یا کوئی نام انسان کی اِس پرورش سے خالی اور الگ نہیں ہے۔ لہٰذا ربّ میں خدا کے دوسرے تمام ناموں کے معنی بھی آتے ہیں، نیز یہ کہ ربّ میں، ربّ کے اسم میں اللہ کی پہچان اِس لئے ہے کہ اُسمیں خداوندِ عالم کے اسماء کا ظہور ہے۔ مثلاً اللہ کا کیا کام ہے وہ اس میں ہے، رحمان کا کیا مطلب ہے یا رحمان سے انسان کا کیا رشتہ ہے، وہ اِس میں ہے اور اسی طرح خدا کے دوسرے سب نام جو ہیں اِس میں کارفرما ہیں، اور اِس لئے ربّ کی پہچان نفس کی پہچان میں ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ پروردگار کے تمام ناموں کا جلوہ یا کہ ظہور یا کہ فعل کس طرح واقع ہوتا ہے انسان کو ترقّی دینے میں، انسان کی عقلی، رُوحانی اور جسمانی پرورش میں خدا کیا کرتا ہے، تو اُس میں خدا کی ساری قدرت آتی ہے، خدا کے افعال کا مظاہرہ ملتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ خدا کی پہچان ہوتی ہے۔

اسکے علاوہ اور بھی اِس میں کچھ خاص یا کہ بلند ترین قسم کے راز ہیں، اور اُن میں سب سے بڑا راز یہ ہے کہ خداندِ عالم نے انسان کو جو رُوحیں عطا کر دی ہیں اُن میں سے ایک اعلیٰ رُوح ایسی ہے کہ اُس میں خدا کی خدائی کا مظاہرہ ہو جاتا ہے، وہ رُوحِ قدسی ہے اور خدا کی پہچان اُسی میں مکمل ہو جاتی ہے، تو رُوحِ قدسی میں یہ قوت ہے کہ وہ خود خدا کی نمائندگی کرتی ہے یعنی خدا کی صفات اور خدا کے افعال اُس سے ظاہر ہو جاتے ہیں، یا یوں کہنا چاہیے کہ رُوح ایک ایسی طاقت ہے، کہ رُوح ایک ایسا معجزہ ہے، وہ خدا کا ایک ایسا کرشمہ ہے کہ وہ خدا کا رُوپ دھارتا ہے، [رُوح] خدا کے رُوپ میں ظاہر ہو جاتی ہے، انہی وجوہات سے خدا کی معرفت کتابِ نفس میں مکمل ہو جاتی ہے۔ آپ عزیزان یہ بھی جانتے ہیں کہ معرفت دینِ اسلام میں سب سے وسیع المعنی لفظ ہے، کیونکہ اِس معرفت سے رُوح کی شناخت بھی مراد ہے، خدا کی پہچان بھی مراد ہے، اور خدا کے اوصاف کی شناخت بھی مراد ہے۔ بہشت، دوزخ، عرش، کُرسی، لوح، قلم، فرشتے، جنّات، ارواح، کائنات، ازل، ابد، اور ہر چیز کی شناخت مراد ہے۔ گو کہ ایک ہی لفظ ہے کچھ زیادہ الفاظ نہیں ہیں، لیکن معرفت کا سادہ ترجمہ پہچان ہے اور پہچان مشاہدے کا نتیجہ ہے یعنی دیکھنا اور پہچاننا، تو اِس لئے ہر چیز کو چشمِ حقیقت سے اور چشمِ بصیرت سے دیکھنے کے معنی ہیں اسکے اندر۔ صرف دیکھنے کے معنی نہیں ہیں بلکہ تحقیق کے ساتھ پہچاننے کے معنی بھی ہیں، تو معرفت ایک ایسی چیز ہے۔ اِس لئے

حضرت مولانا علی صلوات اللہ علیہ نے یہی ارشاد فرمایا کہ: ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّه'' اور دوسرے ارشاد میں فرمایا کہ ''اَعْرَفُکُمْ بِنَفْسِهِ اَعْرَفُکُمْ بِرَبِّهِ'' تم میں سے جو لوگ اپنے نفس کو زیادہ پہچانتے ہیں وہ اپنے پروردگار کو زیادہ پہچانتے ہیں، تو اِس ارشاد میں امامِ اوّل نے معرفت کے درجات مقرر کر دیئے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ معرفت کے درجات مختلف ہیں یعنی مومنین معرفت کے مختلف درجات پر ہیں سب ایک جیسے نہیں ہیں، کسی کو معرفت زیادہ ہے تو کسی کو معرفت نسبتاً کم ہے، اور ہر حال میں معرفت کا جو راستہ ہے وہ کشادہ ہے، کہ ہر مومن اپنی معرفت میں اضافہ کر سکتا ہے، اور معرفت کی بنیاد اقرار سے شروع ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے پروردگار کے وُجود کیلئے اقرار کرنا پڑتا ہے اور وہیں سے معرفت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ معرفت کے بڑے درجات تین ہیں، ایک تو علمُ الیقین کا درجہ ہے، دُوسرا عینُ الیقین ہے اور تیسرا حقُ الیقین ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا چاہیئے کہ اسلام کے اندر جو اصطلاحات ہیں یا جو الفاظ ہیں، جو اُونچے اُونچے الفاظ ہیں وہ آگے چل کر مِل جاتے ہیں، آپس میں ایک ہو جاتے ہیں، جیسے معرفت اور یقین آگے چل کر مِل جاتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ یقین بھی معرفت ہے۔ اِس کا ثبوت قرآن سے یوں ملتا ہے کہ خداوندِ عالم حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو آسمان زمین کی ملکوت دکھائی تا کہ وہ ''مُوْقِنِیْنَ'' (۶:۷۵) میں سے ہو جائے، یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ اِس کی وضاحت اِس طرح سے ہے کہ خداوندِ عالم نے پردے کو اُٹھایا اور آسمان زمین کی رُوحانیت حضرت ابراہیمؑ کو دکھائی۔ ملکوت کے دو معنی ہیں، ایک تو اسکے معنی بادشاہی کے ہیں، ایک تو اسکے معنی مَلک سے فرشتگی کی کیفیت [کے] ہیں اور دونوں کا مطلب رُوحانیت میں مل جاتا ہے تو خداوندِ عالم نے آسمانوں اور زمین کی رُوحانیت کا مشاہدہ کرایا ابراہیمؑ کو تا کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں، تا کہ وہ عارفوں میں سے ہو جائیں، مُرادیہ ہے۔ آپ جب قرآنی الفاظ کا تجزیہ کرنے لگیں گے تو اُس وقت یقین کا جو لفظ ہے آپ کو ملے گا جو بہت ہی وزن رکھتا ہے اور وہ معرفت اور علم کے معنی رکھتا ہے۔ بہر حال مومن کو چاہیئے کہ وہ پُر اُمید ہو کر راہِ معرفت میں آگے بڑھے کیونکہ معرفت ہی میں ابدی نجات ہے، اور معرفت ہی کہ لئے مومن کی رُوح دُنیا میں آئی ہے۔

آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ دُنیا میں آنے کے بہت سے مقاصد ہیں، ایک نہیں کئی ہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ لیکن اُن مقاصد میں سے ایک مقصد بادشاہ کی طرح سب سے بالاتر ہے، وہ مقصدِ اعلیٰ ہے، وہ سب سے بلند مقصد ہے، اِس بلند ترین مقصد کے تحت بہت سارے مقاصد آجاتے ہیں اور وہ بلند ترین مقصد کیا ہیں؟ وہ خدا کی شناخت ہے۔ خدا کی شناخت یعنی عربی میں معرفت ہے اور یہی سبب ہے کہ قرآن میں جن جن اعمال کا ذکر ہوا ہے اُن اعمال کے مطابق کسی نہ کسی اجر و صلے کا بھی ذکر ہوا ہے۔ کہیں نجات کا ذکر ہے، کہیں جنّت کا ذکر ہے، کہیں کسی اور نیک صلے کا ذکر ہے۔ لیکن معرفت کا جہاں ذکر آتا

ہے اُسمیں ایسی چیز کا ذکر ہے کہ اُسکی مثال قرآن میں، اسلام میں نہیں ملتی ہے، کیا ہے وہ؟ خدا نے حدیثِ قدسی میں یہ مفہوم دیا ہے کہ جہاں معرفت کا مقصد پورا ہو جائے گا تو اُسوقت خدا ایک خاموش خزانے کی طرح اپنی ذات وصفات کو اُس مومن کے اور اُس عارف کے سپرد کر دے گا۔ یعنی جو خدا کو پہچانے گا، خدا اُس کو آقا کی طرح نہیں ملے گا، بادشاہ کی طرح نہیں ملے گا، اور کسی اور معنی میں نہیں ملے گا، کسی اور نام سے نہیں ملے گا لیکن وہ ایک خاموش خزانے کی حیثیّت سے ملے گا۔ مومن جب سوچے گا تو اُس پر مطلب صاف ہو جائے گا کہ اِس میں مہربانیوں اور رحمتوں کی انتہا ہے، اور وہ یوں ہے کہ جب مومن معرفت کے ایک اعلیٰ مقام کو پہنچے گا، تو اُس پر یہ رحمتِ ایزدی کا سب سے بڑا راز کھل جائیگا کہ وہ مونور یا لزم کی صورت میں، خدا کی توحید میں، خدا کی وحدانیت میں، خدا کی ذات وصفات میں ازلی اور ابدی طور پر ایک ہے، مومن یہ محسوس کرے گا، اسکا ادراک ہو جائیگا، یہ جاننے لگے گا تو یہ ہوا خدا کا مردِ مومن کو ایک خاموش خزانے کی طرح مل جانا، اور اِس سے بڑھ کر کوئی عنایت نہیں ہے، یہ تو بہشت سے بہت اُونچی دولت ہے اور قرآن وحدیث کے بہت سے ارشادات اِس مقام پر اِس معنی میں مِل جاتے ہیں، بہت سے اِرشادات مل جاتے ہیں۔ مثلاً ایک یہ بھی ملتا ہے جو حدیثِ قدسی ہے کہ ’’یَابْنِیْ اٰدَمَ اَطِعْنِیْ اَجْعَلْكَ مِثْلِیْ حَیًّا لَا تَمُوْتُ ‘‘اے ابن آدم! میرا کہا مان یعنی میری اطاعت کر، میری فرمانبرداری کو اپنا، تا کہ میں تجھ کو اپنی مانند بناؤں گا۔ تو مومن کو سوچنا چاہیئے کہ خدا مومن کو اطاعت وفرمانبرداری کے نتیجے میں اپنے مانند بنالیتا ہے تو اُسمیں دو خدا تو نہیں ہوتے ہیں؟ ایک قدیم خدا، ایک جدید خدا یہ تو ناممکن ہے، اور پھر کیا ہوگا؟ بس یہی راز اُس پر منکشف ہو جائے گا کہ مومن جاننے لگے گا کہ اُس کی انائے عُلوی خدا کی خدائی میں ازلی و ابدی طور پر ایک ہے کیونکہ خدا ایک (unity) ہے۔

خدا کے بہت سے درجات ہیں، خدا کے جیسے بہت سے نام ہیں اسطرح اُس کے بہت سے درجات ہیں، لیکن سب سے بڑے درجے میں خدا کیا ہے؟ ایک توحید ہے، ایک وحدانیت ہے، ایک (unity) ہے۔ تو اُس (unity) میں مومن کی بھی (unity) ہے۔ (unity) اور (unity) اور (unity)، تو کیا اُسمیں تین یونیٹیاں ہوتی ہیں؟ تین وحدتیں ہوتی ہیں؟ نہیں وہ ایک ہی (unity) ہے۔ آپ ہزار وحدتوں کا تصوّر کریں لیکن وہ مل کر ایک وحدت ہوگی۔ وہ ایک وحدت ہوگی، جسطرح ہم یہاں جتنے مومنین بیٹھے ہیں اگر وحدت کی مثال لیں تو اگر مانا جائے یا کہا جائے کہ ہم ایک ہیں تو اُسمیں ہر چند کہ ہم بہت زیادہ ہیں لیکن ہم جب کہتے ہیں یا جب مانتے ہیں یا جب ایسی دلیل ملتی ہے یا ایسا ثبوت ہوتا ہے کسی بھی کام میں یا ایمان میں، یا رُوح میں، یا دین میں، یا ارادے میں، خیال میں، تصوّر میں، نظریے میں، جب ہم کہتے ہیں ایک ہیں، تو یہاں پر ایک ہی (unity) ہے، تو دو وحدتیں یہاں نہیں ہوسکتیں، اسی طرح لاکھ ہوں رُوحیں، لاتعداد ہوں یا بیشمار لیکن جب کہا جائے کہ ایک ہیں تو اُس میں ایک ہیں۔ جب کہا جاتا ہے ’’قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ‘‘(۱۱۲:۱) خدا کی

(unity)ایسی ہے کہ وہ تمام ہستیوں کی (unity) ہے۔

اِس مونو ریالزم کو آسان سمجھنے کیلئے، اسکے ماحول میں، اسکے چوگرد میں ایسے اور نظریات ملتے جلتے نظریات اور ہیں، مثلاً تصوّف کا ایک نظریہ ہے جو کہا جاتا ہے ''ہمہ اُوست'' اور اپنے زمانے کے مطابق پیر ناصر خسرو قس بھی فرماتے ہیں ایک ایسی کتاب میں جس میں اُنھوں نے نوّے سوالات کے جوابات مہیّا کر دیئے ہیں، تو وہ ایک مقام پر آ کر فرماتے کہ ''گر پرسند کہ خدائے چیست بو یم خدائے ان است کہ ہمہ اُوست۔ ترجمہ: اگر لوگ ہم سے پوچھیں خدا کی تعریف کیلئے اور کہیں کہ خدا کیا ہے بتاؤ؟ تو میں بتاؤں گا کہ خدا وہ ہے کہ سب کچھ وہی ہے۔'' اسمیں ''ہمہ اُوست'' بھی اِس مونو ریالزم کے قریب کا ایک تصوّر ہے اور اگر اِس کے علاوہ تیسرے نظریے کو مانیں کہ ''ہمہ از اُوست''، یہ مختلف ہے، ''ہمہ اُوست'' اور ''ہمہ از اُوست'' میں فرق ہے، اور ہر چیز اُس سے ہے، یہ تو عام نظریہ ہے اور بہت عام ہے اور ابتدائی نوعیت کا نظریہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جو نظریات ہیں اُن کا بھی ارتقاء ہوتا ہے، میں نے کسی مقالے میں یہ عرض کیا تھا، یہ لکھا تھا کہ نظریہ جو ہے، اگر نظریات کو ترتیب دیں اور اُنکے درجات مرتّب کریں، تو سب سے پہلے نظریات کی ترتیب جو بنتی ہے، اُس میں صفر کی طرح وہ دہریّت ہے [یعنی] خدا نہیں ہے، یہ سب سے پہلا نظریہ ہے۔ اُس کے بعد دوسرے درجے میں جو نظریہ آتا ہے وہ خدا کی ہستی کیلئے اقرار کرنا ہوتا ہے، اب پھر خدا کی ہستی کیلئے اقرار کرنے کے بعد ایک دم سے سب سے اعلیٰ درجہ نہیں آتا ہے، پھر وہ مختلف ہستیوں کو خدا ماننا جیسے بہت سے بُتوں کو ماننا، یہ نظریہ آتا ہے۔ پھر اُسکے بعد یہود کا نظریہ آتا ہے اور نصاریٰ کا نظریہ آتا ہے، جو کچھ کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ اصل نظریہ تو ایک ہے سب پیغمبروں کا پھر اُسکے بعد اسلام کا نظریہ آتا ہے اور اسلام کے نظریات بٹے ہوئے ہیں، مختلف لوگوں نے اپنے علم اور اپنی رَسائی کے مطابق نظریات مقرّر کئے تو کرتے کرتے تصوّف اسلام کے اندر ایک رُوحانی ترقّی ہے، اور پھر تصوّف سے آگے بڑھ کر پھر دَورِ حقیقت ہے اور اُسکے بعد پھر دَورِ قیامت ہے، اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ قیامت بہت سے انقلابات کا مجموعہ (collection) ہے، ایک قیامت کے اندر بہت ساری قیامتیں ہیں، وہ اُن قیامتوں کا مجموعہ ہے۔ یعنی قیامت تو اصلاً رُوحانیت میں ہے اور خدا سے قربت کا نام، نزدیکی کا نام قیامت ہے، لیکن چونکہ ظاہر جو ہے وہ باطن کے نیچے آتا ہے یا کہ رُوحانیت کے نیچے جسمانیت اور مادّیت آتی ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ جب قیامت آئے گی، گو کہ وہ رُوحانی طور پر آئے گی لیکن دُنیا کو متاثر کئے بغیر نہیں رہے گی۔ لہٰذا قیامت کے کچھ ظاہری پہلو بھی ہیں، جو رُوحانی قیامت کے زیرِ اثر ہیں۔

چنانچہ یہ جو تصوّر دیا مونو ریالزم کا، یک حقیقت کا، یہ بھی ایک نظریاتی یا کہ علمی اور تصوّراتی قیامت ہے اور یہ عظیم ہے اور بہت بڑی قیامت ہے۔ جسطرح تمام مضامین میں خدا کا مضمون سب سے اُونچا ہے، سب سے اہم ہے، اسی طرح تمام نظریات میں خدا کی وحدانیت کا نظریہ عظیم ہے اور جب اِس نظریے میں انقلاب آئے گا تو سارے مضامین میں اور سارے

عُلوم میں، اور سارے تصورات میں انقلابات آئیں گے، کہ جسطرح اسلام یعنی ایک کلمے سے شروع ہو جاتا ہے "لآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ" اسکے اندر وحدانیت کا تصّور رہے، وضاحت کے بغیر ہے، وضاحت کے بغیر ہے، تو چنانچہ خدا کا جو تصوّر رہے، خدا کی وحدانیت کا، خدا کی یکتائی کا، اور خدا کی (unity) کا جو تصوّر رہے، اُسمیں جب بھی انقلاب آئیگا تو سارے عُلوم میں انقلاب آئیگا، اور سارے مضامین بدل جائیں گے، مثلاً ایک انسان کو انسان کی طرح اپنے معاد کی طرف جانا کہاں اور ایک انسان کو اپنے مراحل طے کرنے کے بعد خود کو خدا پانا کہاں؟ اسمیں آسمان زمین کا فرق ہے۔ بہرحال امام نے یعنی حضرت مولانا امام سلطان محمّد شاہ صلوات اللہ علیہ نے دُنیا کے بہت سے گوشوں میں اور بہت سے موضوعات میں، اسلام میں، دین میں، عبادت میں، اور بندگی میں اور خدا کے تصوّر میں انقلاب لایا، اور سب سے بڑا انقلاب جو میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ اُس نے ہم کو مونوریالزم کا تصوّر دیا۔

اسکو سمجھنے کی ضرورت ہے اور اچھی طرح سے پُر اُمید ہو کر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم اُسکو نہیں سمجھ سکتے ہیں جب تک کہ ہم با عمل نہ ہو جائیں، جب تک کہ ہم علم اور عمل دونوں میں آگے نہ بڑھیں تو ہم اسکو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ابھی میں نے جسطرح وضاحت کی یہ تو آپ کیلئے ایک خاکہ ہے اور اِس کو سمجھنا اُسوقت ہوگا جب آپ رُوحانیت کے میدان میں آگے بڑھیں گے اور دیدۂ باطن سے آپ اپنی رُوح کو دیکھیں گے کہ رُوح کیا شئی ہے اور دیدارِ خداوندی کو حاصل کریں گے کہ دیدار کیا ہے اور پھر معرفت حاصل ہوگی اور معرفت کب مکمل ہو سکتی ہے جبکہ آپ اپنی رُوح کو خدا کے نور میں واصل پائیں گے تو تب بیشک آپ اس اِرشاد کے مطابق خود کو پہچان سکتے ہیں اور پروردگار کو پہچان سکتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ میں اپنی گفتگو کو ختم کروں گا اور میں یہ چاہوں گا کہ اِس سلسلے میں اگر کوئی سوال اُبھرا ہو تو بیشک وہ آگے کیا جا سکتا ہے۔ ہم کوشش کریں گے اُس سوال کے جواب کو مہیّا کر دینے کیلئے۔ شکریہ۔ یا علی مدد۔

سوال: سر، ہم جب مونوریالزم کی بات کرتے ہیں تو ایک پاک تصوّر آتا ہے کہ پوری دُنیا خدا ہے یا دوسرے لفظوں میں خدا سے ہے، تو اِس سلسلے میں (evil) یا شَر کا کیا مقام ہے؟ آپ مونوریالزم کے نظریے کی روشنی میں (evil) کو کس طرح بیان کریں گے؟

جواب: اِس سوال کی قدر کرتا ہوں اور بڑی قدردانی کے ساتھ یہ گزارش کروں گا کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں دُنیا کے اندر اِس مادّی عالم میں کہ اُن کا وجود عارضی ہے اور (source) میں اُن کا وُجود نہیں ملتا ہے، ذیلی طور پر، نیچے سے نیچے آ کر اُن کا وُجود بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اِس سلسلے میں ایک بہت عمدہ مثال یہ ہے کہ کوئی سوال کرے کہ جب سورج نکلتا ہے تو تاریکی یا کہ سایہ کہاں جاتا ہے؟ اسکا جواب یوں دیا جائیگا کہ سورج کے سرچشمے میں سائے کا وُجود نہیں ہے، لہٰذا کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ سایہ جو ہے سورج کیطرف لوٹ جاتا ہے اصل میں واصل ہو جاتا ہے بلکہ یہیں پر ختم ہو جاتا

ہے۔ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کو رستے میں وُجود ملتا ہے،اور اصل میں جائیں تو اُن چیزوں کا وُجود نہیں ہے یا یوں کہا جائے کہ وہ نکھر جاتی ہیں اور اُن کی آلودگی یا اُن کی جو دُوئی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔مثال کے طور پر خیر اور شر کا جو مسئلہ ہے ہم بآسانی اُس کو اسطرح سے حل کر سکتے ہیں کہ اب یہ سوچنا پڑے گا کہ خیر اور شر میں سے شر جو ہے کیا شرِ محض ہے یا یہ شر ایسا شر ہے جو عارضی ہے،اور خیر جو ہے وہ خیرِ محض ہے یا کچھ عارضی خیر ہے۔جب دو چیزوں کا تصوّر ملتا ہے اُن کے متعلق یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کیا وہ دونوں (equal) ہیں یا ایک کلّی اور ایک جزوی ہے،ایک عارضی اور ایک دائمی بھی ہو سکتی ہے،تو چنانچہ جو شَر ہے وہ عارضی ہے اور جو خیر ہے وہ دائمی ہے،تو اسلئے عاقبت الامر شر پر خیر غالب آتی ہے۔مثلاً اسکا تذکرہ کس طرح ملے گا، شر کا سرچشمہ (devil) ہے،شیطان،خیر کا سرچشمہ ہادیٔ برحق ہے۔ابھی آپ دیکھیں قرآن میں بہت دیر نہیں لگے گی اسکے سمجھنے میں،شیطان کو مُہلت قیامت تک ہے (۱۵:۳۶۔۳۷) اور جب قیامت برپا ہوگی تو شیطان اپنے حیلے اور سب چیز کیساتھ ختم تو شیطان کا جو میدان ہے وہ زمانہ آدم سے لیکر قیامِ قیامت تک پھیلا ہوا ہے اسکے بعد شیطان ختم ہو جاتا ہے۔ختم ہونے کیساتھ یعنی شر پر خیر غالب آ گیا،غالب آنے کے بعد جن کو سزا ملنی چاہئے وہ سزا بھی ملتی ہے،اور کچھ وقت کے بعد سزا مل چکنے کے بعد وہ بھی دُھل جاتے ہیں،دُھل جانے کے بعد شر کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کوئی شر کا نام ونشان نہیں رہتا ہے۔مثال کے طور پر جو مجرم ہیں،جو گناہگار ہیں،جو مشرک ہیں،اُن کو ضرور سزا ملے گی اور بہت لمبے عرصے تک ملے گی، بہت دیر تک ملے گی لیکن اُسکے بعد ایک ایسا وقت آئیگا،ایک ایسا وقت آئیگا کہ جس میں سب رُوحوں کو نجات ملے گی اور جو رُوحیں جہاں سے آئی تھیں وہاں جا ملیں گی پر فرق کیا ہوگا کہ کچھ رُوحیں براہِ راست جائیں گی اور کچھ رُوحیں جہنم میں پڑ پڑ کہ،سڑ سڑ کے جائیں گی تو بہت ساری رُوحوں کا عبادت خانہ جہنم ہوگا اور جہنم کی سزا بھگت کہ وہ جائینگی تو مطلب اسکا یہ ہوا کہ یہ صحیح ہے کہ وہاں جو مونو ریالزم کا مقام ہے اُسمیں سائے نہیں ہیں۔

ایک دوسری مثال میں آپ کو بتاؤں،پانی سے اِس مطلب کی تشبیہہ دے دینگے،آسمان سے بارش برستی ہے تو سب بارش کا پانی صاف اور ستھرا ہوتا ہے جسکا قرآن میں ذکر ہے (۲۵:۴۸)۔اُسمیں کھارا پن نہیں ہے،اُسمیں آلودگی نہیں ہے،گرد وغبار نہیں ہے۔لیکن جتنا پانی سطحِ زمین پر برستا ہے تو اُس پانی کا یا اُن پانیوں کی مختلف صورتیں بن جاتی ہیں۔کچھ صاف پانی ہوتا ہے،کچھ گدلا پانی ہوتا ہے،کچھ گندگی ہوتی ہے،تو یہ فرق کیوں ہوا؟ آسمان میں اور (source) میں کوئی فرق نہیں تھا لیکن فرق ہوا زمین کے چھونے کیساتھ ساتھ،تو رُوحیں اگر ازل کے (source) سے آلودہ آتیں،تو خدا کی طرف سے کوئی گلہ نہ ہوتا کہ اُس نے ازل ہی سے ایسی رُوحیں بنائی تھیں کہ کچھ ناقص تھیں،کچھ آلودہ تھیں،تو لازمی طور پر اِن رُوحوں پر کوئی گلہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ خدا کے قانون پر گلہ ہونا چاہئے کہ اُس نے یہ (difference) وہاں (source) رکھا تھا،ایسا نہیں ہے۔دُنیا میں آنے کیساتھ ساتھ (differences) پیدا ہو جاتے ہیں،مختلف رُوحوں کے

سامنے مختلف اسباب ہوتے ہیں، کچھ اختیارات بھی ہیں، جن سے آلودگی ہوتی ہے لیکن اِس اختیار کے نتیجے میں سزا بھی ملتی ہے اور سزا کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے، وہ وقت ختم ہونے کے بعد پھر وہ (naturally) تمام رُوحیں ایک جیسی ہو جاتی ہیں، ایک جیسی ہونے کے بعد وہ خدا کے حضور میں (accepted) ہو جاتی ہیں، تو یہ اسمٰعیلی مذہب کا تصوّر ہے۔ آپ کو کسی اور مذہب میں یہ تصور نہیں ملے گا۔ وہ نہ تو اِس سوال کے جواب کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ وہ یہ مانتے ہیں کہ جہنم سے بھی چھٹکارا ہے۔ وہ کہتے ہیں "اَبَداً"، وہ "اَبَداً" کے معنی کو نہیں جانتے ہیں، تو یعنی "اَبَدُ الْاٰبِد" تک جہنم میں پڑے رہنے کا تصوّر کرتے ہیں، یہ بات نہیں ہے، ابد کی تاویل ہے اور سوچنے کی بات ہے کہ ایک عرصے کے بعد جہنمیوں کی سزا ختم ہو جاتی ہے اور ہمارے مذہب کے اندر اتنی زیادہ فراغ دلی ہے اور اسقدر زیادہ وُسعتِ قلبی ہے کہ ہم یہ جو تصور رکھتے ہیں گویا کہ اسکا یہ سبب ہے کہ ہمارے دل کے اندر بہت کشادگی ہے اور بہت فراغ دِلی ہے، خدا کے معاملے میں ہم تنگ دل نہیں ہیں۔ گو کہ سزا کو مانتے ہیں اور وہ صحیح ہے اور وہ سزا بھی کسطرح سے ہے، اِس مقام پر اُسکی بھی میں ذرا تشریح کروں، ایک رُوح گدے میں یا کتّے میں یا کسی جانور میں مبتلا ہے تو یہ اُسکے لئے جہنم ہے اور جس آگ کا قرآن میں ذکر ہے وہ آتش نادانی ہے تو دُنیا کے اندر جتنے جانور ہیں وہ نادانی کی آگ میں جل رہے ہیں۔

اب یہ سوال کہ کتّا تو کوئی فریاد نہیں کرتا ہے لیکن جہنمیوں کے متعلق قرآن میں یہ ذکر کیوں آیا ہے کہ جہنمی لوگ یہ کہیں گے بہشتیوں سے عرض کریں گے کہ تم اپنی نعمت میں سے کچھ دو یا پینے کیلئے ذرا ٹھنڈا پانی پہنچا دو، وغیرہ وغیرہ (۷:۵۰)۔ اسکے لئے گزارش یہ ہے کہ جہنمیوں کے متعلق قرآن میں دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ اندھے ہونگے، وہ بہرے ہونگے، وہ گُونگے ہونگے (۲:۱۸) اور اسکے برعکس یہ بھی ہے کہ جہنمی لوگ یہ کہیں گے، اور وہ کہیں گے، تو یہ دو متضاد باتیں کیوں؟ اور اِس سوال کا جواب کون مُہیّا کرے گا؟ میں آپ کو بتاؤں، دونوں باتیں صحیح ہیں۔ ایک کتے میں کوئی رُوح مبتلا ہے تو وہ رُوح گُونگی ہے، بہری ہے، اور اندھی ہے۔ لیکن جہاں جہنمیوں کے فریاد کرنے اور واویلہ کرنے، اور احساس کرنے کا جو ذکر آتا ہے وہ اُن کی صورتحال کی ترجمانی ہے، خدا اُنکی طرف سے ترجمانی کرتا ہے، اُنکی کیفیت و حالت کو (interpret) کرتا ہے۔ باقی ازخود وہ بیشک اندھے ہیں، بہرے ہیں، پتھر بن گئے ہیں، درخت بن گئے ہیں، جانور بن گئے ہیں تو وہ کہاں بولیں گے؟ قرآن کی تاویلات کے اُصول میں یہ بات ضرور آئیگی کہ قرآن کے اندر بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو خدا بیان کرتا ہے۔ بڑی دلچسپ بات میں آپ کو سناؤں، دیکھیں، فرعون کی بیوی کا ذکر قرآن میں ہے، وہ کیا دُعا کرتی ہیں؟ وہ یہ دُعا کرتی ہیں کہ پروردگار! میرے لئے جنّت میں ایسا گھر بنا کہ وہ تیرے قریب ہو (۱۱:۶۶)۔ اب سوچنا یہ ہے کہ آیا یہ جزوی آیت یا پوری آیت فرعون کی بیوی کی ہے یا خدا اُسکی طرف سے (interpret) کرتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ یہ (sentence) یا یہ آیت، یا یہ جملہ یا یہ کلمہ، واقعاً فرعون کی بیوی کا ہے جو مومنہ تھی، تو اُسکو کیا معلوم کہ جنّت میں خدا بھی

انسانوں کی طرح یا مومنوں کی طرح کوئی گھر رکھتا ہے، اور اگر کوئی اُوٹ پٹانگ بات جو انسان کہتے ہیں اُسکو قرآن میں جگہ مِل گئی تو قرآن کا کچھ حصہ حکمت سے خالی ہو جائے گا، وہ انسانوں کا کلام ہوگا بحقیقت خدا کا کلام نہیں ہوگا۔ اسکے لئے یہ ضروری تھا کہ اُن مومنین یا اُن کافروں کی باتوں کو، لفظوں کو چھوڑ کر اُسکے (essence) کو لیکر خدا قرآن بنانے کیلئے جو اُصول رکھتا تھا اسکے مطابق خدا نے کلام بنایا تو ٹھیک حکمت اسمیں آگئی اور قرآن کے شروع سے لیکر آخر تک ایک ہی اُصول بن گیا کہ اُسمیں حکمت اور تاویل آنے کی گنجائش آگئی۔

میں تو یہ مانوں گا کہ یہ بات ایک طرف سے فرعون کی بیوی کی ہے، بیشک! لیکن اسکو خدا نے بنایا ہے اور اِس سے ہم کو یہ حکمت مل گئی کہ خدا کا وُجود بہشت میں انسانی شکل میں ہوگا اور بہشت کے محلات میں سے ایک محل میں خدا ظہور فرما ہوگا اور مزہ اُسی میں ہے، تو فرعون کی بیوی نے یہ خواہش کی کہ بہشت میں یہ فرعون کی بیوی امام کا ہمسایہ بنے، چونکہ ہمارے اُصول کے مطابق خدا کی تاویل امام ہے اور خدا کے عنوان سے یہ جو کچھ بولتی ہے یہ تو امام کیلئے بولتی ہے، تو بیشک امام کا بنگلہ ہوگا بہشت میں اور فرعون کی بیوی نے یہ خواہش کی کہ امام کا ہمسایہ ہو جائے، اور سب سے بڑا یعنی درجہ ہے۔ جیسے رسولؐ نے فرمایا کہ علیؑ جو ہے اس اُمت میں ذوالقرنین کا درجہ رکھتا ہے اور علیؑ کیلئے بہشت میں ایک (special) بنگلہ ہے، [یا علیُّ، إنَّ لكَ كَنزًا مِنَ الجَنَّةِ، وإنَّكَ ذو قَرْنَيْها] تو سب مزہ اسی میں ہے کہ خدا جو ہے وہ انسان کے رُوپ میں آئے چونکہ اُونچی خواہشیں اور نچلی خواہشیں جو ہیں اِس درمیان میں ''خير الأُمُور أَوْسَطُها'' تو اچھے سے اچھا جو کام ہے وہ اوسط میں ہوتا ہے، درمیان میں ہوتا ہے۔ ہم جسم کے تصور کے بغیر سوچیں تو وہ تو ایک خیال جیسی بات ہوگی اور اگر ہم ایک کثیف جسم کو سوچیں تو یہ بھی تو ادنیٰ بات ہوگی، تو بہتر یہ ہے کہ ہم لطیف جسم کو سوچیں اور اُسمیں امامؑ کے دیدار کو مانیں چونکہ قرآن کے اندر خدا کے دیدار کا بہت ساذکر ہے تو اُسمیں امام کا ظہور ہوگا اور وہی امام خدا کی نمائندگی کرے گا اور مزہ اسی میں ہے کہ بہشت میں امامؑ سے بہت نزدیکی ہو، اُسکا دیدار ہو تو کتنی خوشی ہوگی۔ بہرحال کافروں کا یا شیطان کا یا نمرود کا سب کا مفہوم ہے مگر جو (construction) ہے وہ خدا کا ہے، کہ وہ یعنی کہ مکمل حکمت کے تقاضا کے مطابق ہے، لہٰذا تو ہم اِس سوال میں بہت دُور نکلے کہ اصل مطلب کو تقریباً بھول چکے، یہ کہ بہت ساری چیزیں جو ہیں وہ گُم ہو جاتی ہیں، ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور ایک حقیقت جو ازل میں تھی وہ رہتی ہے، جسطرح بارش جو برستی ہے وہ صاف ستھری برستی ہے لیکن زمین کو چھونے کیساتھ ساتھ اُس میں مختلف رنگ آتے ہیں اور اُسمیں مختلف آلودگی ہوتی ہے اور کچھ پانی صاف بھی رہتا ہے تو یہی حال ہے رُوح کا اور خیر و شر کا کہ جو شر ہے وہ عارضی ہے اور جو خیر ہے وہ دائمی ہے۔ یہ اُصول یاد رکھیئے گا کہ جہاں دو چیزیں ہیں آمنے سامنے اُن کو دیکھنا ہوگا کہ آیا دو چیزیں ازل تا ابد (equal) ہیں تو اُنکا کوئی فیصلہ نہیں ہوگا اور یہ جنگ کبھی ختم ہونے والی نہیں ہوگی۔ ابھی ظاہر ہے کہ خیر و شر کی جنگ جو ہے وہ ختم ہوتی ہے اور شر پر خیر غالب آتا

ہے تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ اسمیں جو خیر ہے وہ (permanent) ہے اور جو شر ہے وہ عارضی ہے، کمزور ہے۔ شیطان کے ذکر کیساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی ذکر ملے گا کہ شیطان جو ہے وہ کمزور ہے، کمزور ہے عارضی ہے، اور عارضی ہے کمزور ہے، تو خیر اِس پر غالب آئیگا، تو مطلب اسکا یہ ہے کہ شر کا وُجود ہے ختم ہو جائیگا اور جو اصل ہے اُس تک اسکی رسائی نہیں ہوگی اور اسی کیساتھ آپ کا جو مفید سوال تھا اُسکا جواب مہیا ہو جاتا ہے۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: یاسمین آصف　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پُروف: نسرین اکبر